رسالہ

تحقیقاتِ اسلامی

زیرِ سرپرستی

مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی

مرتّب

مولانا محمد صغیر قاسمی



بسم اللہ الرحمن الرحیم

انجمن دعوت الی الحق کیرانہ ضلع شاملی کا

علمی، دینی، تحقیقی واصلاحی ترجمان

برقی رسالہ

تحقیقاتِ اسلامی

جلد (۱۴) ربیع الثانی وجمادی الاولی ۱۴۴۸ھ مطابق: اکتوبر ۲۰۲۶ء شمارہ (۴)

زیر سرپرستی

حضرت مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی

بانی ومہتمم جامعۃ السعادۃ کیرانہ وصدر انجمن دعوت الی الحق

مرتّب

محمد صغیر قاسمی

09897855010

sagheerqasmi@gmail.com

ترسیل کے لیے رابطہ کریں: محمد معظم رحمانی قاسمی 09359602830

موبائل نمبر: 09359602830 ای میل: tahqiqateislami2011@gmail.com

ادارہ کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

خط وکتابت کا پتہ:

دفتر ماہنامہ "تحقیقاتِ اسلامی"

جامعۃ السعادۃ

محلہ ابراہیم پورہ (آل کلاں) شاملی روڈ کیرانہ ضلع شاملی (یوپی) انڈیا

Add: Office Tahqiqat-e-Islami
Jamiatus Sa'adah, Moh.Ibrahimpura
(Aal Kalan) Shamli Road, Kairana
Distt. Shamli (U.P.) India
A/c No. 3023002100004803
TAHQIQAT-E-ISLAMI
Punjab National Bank, Branch: Kairana

ناشر

تحقیقاتِ اسلامی

۴۴۱ آل خورد (ملتانیان) کیرانہ ضلع شاملی (یو۔پی) ۲۴۷۷۷۴



آئینہ

صریر خامہ

آسائشوں کے ہجوم میں..... محمد صغیر قاسمی پرتاپ گڑھی (۳)

درس قرآن

تفسیر سُوْرَۃُ الْحَاقَّۃ مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی (۷)

مقالات ومضامین:

مسواک اور اس کے فوائد مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی (۱۶)

حضرت مولانا سعید الرحمن اعظمی ندویؒ مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی (۲۱)

انحراف کیا ہے؟ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب (۲۴)

آزمائش ایمان کی کسوٹی مولانا محمد ناصر ندوی پرتاپ گڑھی (۲۶)

کاف ونون کے درمیان! مولانا عبید انور شاہ (۳۰)

اسلام کا اخلاقی پہلو عمر فاروق ندوی فتحپوری (۳۳)

تنہائی کا استعمال محمود الحسن مدراسی (۳۶)

یادرفتگاں

حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی ابوطہ محمد صغیر پرتاپ گڑھی (۳۷)

فقہ وفتاوی مفتی محمد ریحان گودھروی (۴۴)

افسانہ

قصہ چہار درویش میر امن دہلوی (۴۶)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صریر خامہ

آسائشوں کے ہجوم میں گم ہوتی انسانیت

محمد صغیر پرتاپ گڑھی

انسان نے ہمیشہ زندگی کو آسان بنانے کی کوشش کی ہے۔ پہیے سے لے کر جدید ذرائعِ نقل وحمل تک، خط وکتابت سے برق رفتار مواصلات تک، چراغ سے بجلی تک اور کتاب سے ڈیجیٹل دنیا تک، انسانی ذہن نے زندگی کی بے شمار دشواریوں کو سہولتوں میں بدل دیا ہے۔ آج علم، علاج، سفر، تجارت اور روزمرہ کے بے شمار کام بڑی سہولت سے چند لمحوں میں انجام پا جاتے ہیں، جن کے لیے ماضی میں گھنٹوں، دنوں اور بعض اوقات مہینوں کی محنت درکار ہوتی تھی۔

یہ انسانی تہذیب کی بڑی کامیابی ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک بنیادی سوال بھی وابستہ ہے: زندگی آسان ہونے کے ساتھ کیا انسان بھی مطمئن، متوازن اور بہتر ہوا ہے؟ ہمارے عہد کا المیہ یہ ہے کہ آسائشیں بڑھ رہی ہیں اور بے اطمینانی بھی؛ رابطے بڑھ رہے ہیں اور فاصلے بھی؛ معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن علمی پختگی کم ہوتی جا رہی ہے۔

اصل مسئلہ سہولت نہیں، سہولت کے ساتھ ہمارا تعلق ہے۔ جب سہولت ضرورت سے بڑھ کر زندگی کا مقصد بن جائے تو وہ انسان کو مضبوط کرنے کے بجائے کمزور بھی کر سکتی ہے۔ ہم نے وقت بچانے کے لیے ذرائع پیدا کیے، مگر بچا ہوا وقت بھی مصروفیت میں گم ہو گیا۔ رابطے آسان ہوئے، مگر دل کی گفتگو کم ہوئی۔ معلومات انگلی کی ایک جنبش پر حاضر ہو گئیں، مگر سوچنے اور سمجھنے کا ذوق کم ہوتا گیا۔ قرآن مجید انسانی خوش حالی کا معیار محض مادی فراوانی کو قرار نہیں دیتا:

"وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا" (طه: ۱۲۴)

(اور جو کوئی میری یاد سے منہ موڑے گا، اس کے لیے تنگی کا جینا ہوگا۔)

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

"أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ" (الرعد: ۲۸)

(یاد رکھو! اللہ ہی کی یاد سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔)

ان دونوں آیات میں ہماری پوری زندگی کا ایک اہم راز پوشیدہ ہے۔ انسان کے پاس وسائل کی فراوانی ہو اور دل بے سکون ہو تو ظاہری کشادگی، باطنی تنگی کو دور نہیں کر سکتی۔ اس کے برعکس سادہ زندگی گزارنے والا انسان اگر قناعت، شکر اور اللہ سے تعلق کی دولت رکھتا ہے تو محدود وسائل میں بھی ایک ایسی وسعت محسوس کر سکتا ہے، جسے مادی پیمانوں سے ناپا نہیں جا سکتا۔

اسلام دنیا کی نعمتوں سے فرار نہیں سکھاتا۔اس کا صاف اعلان ہے:

"قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَ الطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ" (الاعراف: ۳۲)

(آپ کہیے: کس نے حرام قرار دیا ہے اللہ کے اپنے بندوں کے لیے پیدا کردہ لباس کو جو باعث زینت ہے اور پاکیزہ روزی کو)

اسلام مال کی فراوانی اور آسائش سے نہیں، ان کی غلامی سے روکتا ہے۔دنیا ہاتھ میں رہے تو ذریعہ ہے، دل میں اتر جائے تو مقصد بن جاتی ہے۔انسانی شخصیت بھی صرف آسائش سے نہیں بنتی۔صبر، حوصلہ، خود اعتمادی اور ذمہ داری کے لیے کچھ نہ کچھ مشقت ضروری ہے۔ ہر مشکل مصیبت نہیں ہوتی؛ بعض مشکلات انسان کے اندر چھپی صلاحیتوں کو بیدار کرتی ہیں۔ ناکامی تجربہ دیتی ہے، محرومی شکر سکھاتی ہے، انتظار صبر پیدا کرتا ہے اور ذمہ داری انسان کو اپنی ذات سے بلند ہو کر دوسروں کے بارے میں سوچنا سکھاتی ہے۔

اس حقیقت کو نئی نسل کی تربیت میں سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ہم اپنی اولاد کو ہر ممکن سہولت دینا چاہتے ہیں، دیجیے، اس میں کوئی مضائقہ نہیں، نہ شرعی پابندی ہے، لیکن بچے کو یہ باور بھی کرانا چاہیے کہ ہر خواہش فوراً پوری نہیں ہوتی، ہر مقابلے میں کامیابی نہیں ملتی، ہر اختلاف دشمنی نہیں اور اپنی غلطی تسلیم کرنا کمزوری نہیں۔تعلیم کا مقصد صرف ذہن کو معلومات سے بھرنا نہیں، شخصیت کو سنوارنا بھی ہے۔ہمیں بچوں کو کامیابی کے ساتھ ناکامی برداشت کرنے، آزادی کے ساتھ ذمہ داری اٹھانے اور حقوق کے ساتھ فرائض ادا کرنے کی تربیت دینی ہوگی۔

یہی صورت ہمارے گھروں کی بھی ہے۔سہولتیں بڑھنے کے باوجود باہمی گفتگو اور قلبی قربت کم ہوتی جا رہی ہے۔ ایک ہی گھر میں رہنے والے افراد اپنی اپنی اسکرینوں میں مصروف ہیں۔گھر کی اصل خوش حالی سامان کی فراوانی نہیں بلکہ باہمی محبت، ایک دوسرے کا احترام، تعاون، آپسی تبادلہ خیال اور ایک دوسرے کے لیے وقت ہے۔رسول اللہ ﷺ کی گھریلو زندگی میں تواضع، تعاون اور حسنِ معاشرت کا جو نمونہ ملتا ہے، وہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ انسان کی عظمت بڑے کاموں کے ساتھ روزمرہ کے معمولی معاملات میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ہماری معاشرتی بے سکونی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم اپنے حقوق کے بارے میں حساس اور دوسروں کے حقوق کے بارے میں غافل ہوتے جا رہے ہیں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ"

(مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔)

آج زبان کے ساتھ انگلیاں بھی اظہار کا ذریعہ بن چکی ہیں۔ایک جملہ، ایک تبصرہ یا ایک پیغام لمحوں میں بہت سے لوگوں تک پہنچ جاتا ہے۔اس لیے معاشرتی اصلاح میں اظہار کے آداب پہلے سے زیادہ اہم ہیں۔ ہر بات کہنا ضروری نہیں، ہر راز ظاہر کرنا کمال نہیں، ہر جملے پر تبصرہ کرنا علمی صلاحیت کی دلیل نہیں، ہر اختلاف کو نزاع بنانا دانش مندی نہیں، ہر

خبر آگے بڑھانا خدمت نہیں اور ہر مسئلے ومعاملے میں اپنی ٹانگ لڑانا دانشمندی نہیں۔قرآن کریم اہلِ ایمان کی صفت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

"وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا" (الفرقان: ۷۲)

(اور جب وہ کسی لغوبات کے پاس سے گزرتے ہیں تو باوقار طریقے سے گزر جاتے ہیں۔)

یہ آیت ہمارے عہد میں خاص معنویت رکھتی ہے۔انسان کی پختگی صرف اس سے ظاہر نہیں ہوتی کہ وہ کیا کہتا ہے، بلکہ اس سے بھی کہ وہ کیا کہنے سے اور کیا کرنے سے اپنے آپ کو روک لیتا ہے۔

جدید زندگی نے موازنہ بھی بہت آسان کر دیا ہے۔دوسروں کے گھر، لباس، سفر، کامیابیاں اور آسائشیں ہر وقت ہماری نگاہ کے سامنے ہیں۔انسان اپنی نعمتوں کو بھول کر دوسروں کی زندگی سے اپنا موازنہ کرنے لگتا ہے اور یہی کیفیت بے اطمینانی کو جنم دیتی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"لَيْسَ الْغِنَى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ، وَلَكِنَّ الْغِنَى غِنَى النَّفْسِ"

(یعنی مال داری زیادہ سامان ہونے کا نام نہیں، اصل مال داری دل کی بے نیازی ہے۔) قناعت اور احتیاط ترقی کی ضد نہیں؛ یہ خواہشات کو عقل، ایمان اور ضرورت کے تابع رکھنے کا نام ہے۔

اسی طرح فوری زندگی نے انسان سے انتظار کا حوصلہ بھی کم کر دیا ہے۔فوری جواب، فوری خریداری، فوری اطلاع اور فوری تفریح نے اسے فوری نتیجے کا عادی بنا دیا ہے، حالاں کہ زندگی کی بڑی نعمتیں وقت مانگتی ہیں۔علم پختہ ہونے میں، رشتے مضبوط ہونے میں، شخصیت سنورنے میں اور دعا کے نتائج ظاہر ہونے میں وقت لگتا ہے۔ہر چیز فوری حاصل ہو جائے تو صبر، تحمل اور انتظار جیسی بنیادی انسانی صلاحیتیں کہاں سے پیدا ہوں گی؟

اسی لیے عبادت کی ضرورت جدید دور میں کم نہیں، زیادہ ہوئی ہے۔نماز انسان کو دن کی دوڑ میں بار بار ٹھہرنا سکھاتی ہے، روزہ خواہش کے سامنے ضبط کی تربیت دیتا ہے، زکوٰۃ مال کے ساتھ تعلق درست کرتی ہے اور ذکر دل کو دنیا کے شور سے نکال کر اپنے رب سے جوڑتا ہے۔دین دنیا سے فرار نہیں بلکہ دنیا کے درمیان رہ کر اپنے مقصد کو محفوظ رکھنے کا نام ہے۔

علامہ اقبال نے کہا تھا:

تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

انسان کے سامنے صرف مادی ترقی کا آسمان نہیں؛ اخلاق، علم، روحانیت، خدمت اور بندگی کے بھی آسمان ہیں۔اس لیے ترقی کا معیار صرف یہ نہیں کہ ہمارے پاس کیا کچھ بڑھا، بلکہ یہ بھی ہے کہ ہم خود کتنے بہتر ہوئے۔

اگر دولت بڑھی اور سخاوت نہ بڑھی، علم بڑھا اور تواضع نہ بڑھی، رابطے بڑھے اور تعلقات کمزور ہو گئے، آسائش

بڑھی اور شکر کم ہو گیا، تو یہ ترقی ادھوری ہے۔ دنیا کی ترقی انسان کے لیے نعمت اسی وقت بنتی ہے جب اس کے ساتھ انسانی ترقی بھی ہو۔ ہمیں دنیا کو آسان بنانے کی کوشش جاری رکھنی چاہیے، لیکن اس کے ساتھ انسان کو مضبوط، با کردار اور با مقصد بنانا بھی ضروری ہے۔ زندگی کی اصل آسانی یہ نہیں کہ انسان کے راستے میں کوئی مشکل باقی نہ رہے؛ اصل آسانی یہ ہے کہ مشکلات اس کے ایمان، حوصلے اور اخلاق کو شکست نہ دے سکیں۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سہولتوں کو کم نہیں، ان کے استعمال کا شعور زیادہ کریں؛ دنیا سے کنارہ کشی نہیں، دنیا کے ساتھ صحیح تعلق پیدا کریں؛ بچوں کو صرف کامیابی نہیں، کردار بھی دیں؛ گھروں کو صرف آسائش نہیں، محبت بھی دیں؛ اور اپنی ترقی کو صرف وسائل کے پیمانے سے نہیں، اخلاق و انسانیت کے پیمانے سے بھی جانچیں۔

دنیا آسان ہوتی رہے، یہ انسانی ترقی ہے؛ مگر اس آسان دنیا میں، انسان بن کر رہنا ہماری دینی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔ سہولتیں بڑھیں تو شکر بڑھے، علم بڑھے تو تواضع بڑھے، دولت بڑھے تو سخاوت بڑھے، رفتار بڑھے تو تحمل باقی رہے اور رابطے بڑھیں تو رشتوں میں بھی قربت پیدا ہو۔ یہی وہ توازن ہے جس سے جدید زندگی واقعی انسانی زندگی بن سکتی ہے۔

ورنہ خطرہ یہی ہے کہ ہم ایسی دنیا تعمیر کر لیں جہاں زندگی کے بیشتر کام آسان ہوں، مگر انسان بن کر جینا مشکل ہو جائے۔

درس قرآن کریم

سُورَۃُ الحَاقَّۃ

مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَلَآ أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُونَ ۝ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۝ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝ تَنزِيلٌ ۝ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝ فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِينَ ۝

ترجمہ

سو قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جو دیکھتے ہو۔ اور جو چیزیں کہ تم نہیں دیکھتے۔ یہ کہا ہے ایک پیغام لانے والے سردار کا۔ اور نہیں ہے یہ کہا کسی شاعر کا تم تھوڑا یقین کرتے ہو۔ اور نہیں ہے کہا پریوں والے کا تم بہت کم دھیان کرتے ہو۔ یہ اتارا ہوا ہے جہان کے رب کا۔ اور اگر یہ بنا لاتا ہم پر کوئی بات۔ تو ہم پکڑ لیتے اس کا داہنا ہاتھ۔ پھر کاٹ ڈالتے اس کی گردن۔ پھر تم میں کوئی ایسا نہیں جو اس سے بچا لے۔

تشریح وتفسیر

"فَلَآ أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُونَ۔ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ۔ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ۔ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ۔ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ۔" (سو قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جو دیکھتے ہو۔ اور جو چیزیں کہ تم نہیں دیکھتے۔ یہ کہا ہے ایک پیغام لانے والے سردار کا۔ اور نہیں ہے یہ کہا کسی شاعر کا تم تھوڑا یقین کرتے ہو۔ اور نہیں ہے کہا پریوں والے کا تم بہت کم دھیان کرتے ہو)

"فَلَآ أُقْسِمُ" میں یا تو "لا" نفی کا ہے، اس صورت میں ترجمہ ہوگا "میں قسم نہیں کھاتا" کیونکہ بات کھلی ہوئی ہے، قسم کھا کر اس کو پختہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یا "لا" زائد ہے، اس صورت میں ترجمہ ہوگا "میں پختہ قسم کھاتا ہوں"۔ (مظہری)

لیکن بعض اہل علم کا خیال یہ ہے کہ یہ زائد نہیں ہوتا اور نہ قسم کی نفی کے لیے آتا ہے، بلکہ یہ قسم سے پہلے مخاطب کے اس خیال کی تردید کے لیے آتا ہے جسے رد کرنے کے لیے قسم کھائی گئی ہو۔ ہم اپنی بول چال میں بھی بعض دفعہ قسم کے آغاز میں "نہیں" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً مخاطب ایک بات کہتا ہے تو ہم اس کی تردید میں قسم کے ساتھ تاکید پیدا کرتے

ہوئے جو بات کہتے ہیں اس سے پہلے حرف نفی لاتے ہیں۔ مثلاً ہم اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے یہ اسلوب اختیار کرتے ہیں، ''نہیں، خدا کی قسم یہ بات نہیں ہے بلکہ بات اس طرح ہے''۔ قرآن کریم نے بھی اس آیت میں یہی اسلوب اختیار کیا ہے اور اس اسلوب کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مخاطب یہ بات سمجھ لیتا ہے کہ متکلم میری بات کو اس قدر غلط سمجھتا ہے کہ وہ اپنی بات کی تردید میں کچھ کہنے سے پہلے حرف نفی لا کر یہ تصور دینا چاہتا ہے کہ تمھاری بات اس قابل نہیں کہ اس پر غور بھی کیا جائے۔

قسم کے بارے میں یہ جان لینا چاہیے کہ قسم کے بعد جو جملہ آتا ہے اسے جوابِ قسم کہتے ہیں اور جوابِ قسم کی حیثیت دعویٰ کی ہوتی ہے۔ اور قسم بالعموم دعویٰ کی شہادت اور اس کی دلیل کے طور پر کھائی جاتی ہے۔

پیشِ نظر آیتوں میں قسم اور جوابِ قسم کا مفہوم: پیشِ نظر دو آیتوں میں جو قسم کھائی گئی ہے اس کا جوابِ قسم جس کی حیثیت دعویٰ کی ہے وہ، وہ بات ہے جس کا ذکر اگلی آیت میں کیا گیا ہے۔ لیکن اس دعوے کی وضاحت میں اہل تفسیر میں اختلاف ہوا ہے۔ بعض اہل علم کا گمان یہ ہے کہ دعویٰ تو بیشک اگلی آیت ہی ہے، لیکن یہ اس دعویٰ کی ظاہری حیثیت ہے۔ اصل دعویٰ وہ ہے جسے سورۃ کے عمود کی حیثیت حاصل ہے اور وہ اثباتِ جزاء وسزا ہے۔ مخالفین کا اصل انکار اس بات سے تھا کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ قیامت آئے گی اور وہ دن جزاء وسزا کا دن ہوگا۔ ہر شخص اپنے زندگی کے اعمال کے اعتبار سے جوابدہی کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے گا، نیکیوں پر جزاء ملے گی اور برائیوں پر سزا ملے گی۔ جس کا نتیجہ جنت یا جہنم ہوگا۔ یہ باتیں سراسر افسانہ معلوم ہوتی ہیں جنھیں عقل تسلیم نہیں کرتی۔ لیکن وہ اس کے انکار کے لیے ہدف نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بناتے تھے کہ تم قیامت کے وجود پر قرآن کریم سے آفاق وانفس اور عقل ونقل کے دلائل پیش کرتے ہو اور اس کے لیے بڑا خوبصورت پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہو اور اس کے بارے میں تمھارا دعویٰ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا ہے، ہم اسے ماننے کے لیے تیار نہیں، تم جو کچھ وحیِ الٰہی کی صورت میں پیش کر رہے ہو یہ دراصل ایک شاعر یا کاہن کا کلام ہے۔ اور جنات یا شیاطین تمھارے دل میں اسے القاء کرتے ہیں۔ اس طریقہ سے وہ قرآن کریم اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بے اعتبار ٹھہرا کر عقیدۂ قیامت کو بے اثر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس عقیدے کے اثبات کے لیے قسم کھا کر اپنے دعوے کو مؤکد کیا ہے۔

سب سے پہلے حل طلب بات یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے اس کا مفہوم کیا ہے۔ بات کو اگر لپیٹ کر کہیں تو مطلب بالکل واضح ہے کہ پروردگار ارشاد فرماتے ہیں کہ قسم ہے ان تمام چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو یا دیکھ سکتے ہو اور ان تمام چیزوں کی جن کو تم نہ دیکھتے ہو اور نہ دیکھ سکتے ہو۔ ظاہر ہے کہ اس میں تمام مخلوقات کا ذکر آ گیا۔ یعنی جہانِ دیدہ بھی اور نادیدہ عالم بھی۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ نہ دیکھنے کی چیزوں سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات ہے۔ اور دیکھنے کی چیزوں سے مراد، دنیا کی چیزیں ہیں۔ (مظہری)

بعض اہل علم کا خیال یہ ہے کہ اس سورۃ میں جزاء وسزا پر جو دلائل قائم کیے گئے ہیں، وہ دو طرح کے ہیں۔ ایک کا

تعلق اس عالم سے ہے اور دوسرے کا تعلق اس نادیدہ عالم سے جس کو یہاں آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ پہلی قسم کی دلیل سابقہ قوموں کی تاریخ اور ان کی تباہی کے آثار سے قائم کی گئی ہے اور یہ وہ دلیل ہے جس کو اہل عرب دیکھتے تھے اور آج بھی دنیا کے مشاہدے میں آتی ہے۔ اور دوسری قسم کی دلیل آخرت کے وہ احوال ہیں جو اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کو پیش آنے والے ہیں۔ ان کا تعلق آخرت سے ہے اور ظاہر ہے آج انہیں آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس جہان میں پیش آنے والے مکافاتِ عمل کے بعد ان کی حقیقت سے آج پردہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ ان دونوں طرح کے دلائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دونوں طرح کے واقعات کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جہاں تک تاریخی واقعات کا تعلق ہے ان کو تم آج بھی دیکھ سکتے ہو۔ اس لیے جزاء وسزا پر ان کے دلیل ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اور جہاں تک عالم آخرت کا تعلق ہے انہیں آج تم اپنے سر کی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے، لیکن عقل ان کا انکار نہیں کرسکتی، کیونکہ قوموں کی تاریخ اس پر شاہد ہے اور آفاق وانفس کے شواہد اس پر دلیل ہیں۔

جن اہل علم نے اگلی آیت کے منطوق ومفہوم کو من وعن جوابِ قسم یعنی دعویٰ ٹھہرایا ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ قریش مکہ کو اس بات سے انکار تھا کہ قرآن کریم نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوتا ہے اور ایک فرشتہ لے کر ان پر اترتا ہے۔ لوگ اس کی فصاحت و بلاغت اور اعجاز آفرینی سے متاثر ہوکر اس کو کلام خداوندی سمجھ بیٹھتے ہیں حالانکہ کوئی جن یا شیطان ہے جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دل پر اس کلام کو القاء کرتا ہے۔ اور یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں، جنات اور شیاطین ہمیشہ شاعروں اور کاہنوں پر اپنا کلام القاء کرتے رہتے ہیں اور وہ اسی کی مدد سے شعر کہتے اور عالم غیب کی خبریں دیتے ہیں، اس لیے آپ درحقیقت ایک شاعر اور کاہن ہیں، اللہ تعالیٰ کے رسول نہیں جن پر وحی اترا کرتی ہے۔ اس کی تردید کرتے ہوئے پروردگار نے ان چیزوں کی قسم کھائی ہے جن کو انسانی نگاہیں دیکھتی ہیں اور ان چیزوں کی قسم کھائی ہے جو نگاہوں کی حدود سے ماوراہیں۔

اس سلسلے میں ان اہل علم کا خیال یہ ہے کہ رسول کریم سے مراد نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات گرامی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ''سورہ تکویر'' آیت:۱۹/ میں بالکل انہیں الفاظ میں حضرت جبرئیل (علیہ السلام) کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ اس کے بعد جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ حضرت جبرئیل (علیہ السلام) کی ہیں، کسی اور کی نہیں۔ لیکن یہاں اس لیے حضرت جبرئیل (علیہ السلام) مراد نہیں لیے جاسکتے کہ قریش حضرت جبرئیل (علیہ السلام) کو شاعر یا کاہن نہیں کہتے تھے اور نہ حضرت جبرئیل کی ذات زیر بحث تھی۔ شاعر اور کاہن ہونے کا الزام وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر لگاتے تھے۔ اس لیے یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات گرامی ہے۔

رہی یہ بات کہ قرآن کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یا حضرت جبرئیل کا قول کس معنی میں کہا گیا ہے کیونکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ بات یہ ہے کہ قول کا معنی ہمیشہ کلام نہیں ہوتا، بلکہ بعض دفعہ کسی کا کلام جس شخص کی زبان سے نکلتا ہے

اسے اس کا قول قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی اسی لیے اس کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قول کہا گیا ہے کہ لوگ اسے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان سے سنتے تھے۔ اور حضرت جبرئیل کا قول اس معنی میں ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قرآن کریم کو حضرت جبریل سے سنتے تھے، لیکن آگے چل کے یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ یہ فی الحقیقت رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور حضرت جبرئیل کی حیثیت بقول شاعر صرف یہ ہے کہ:

میں ان کے مطلب کی کہہ رہا ہوں، زبان میری ہے بات ان کی
میں ان کی محفل سجا رہا ہوں، چراغ میرا ہے رات ان کی

اس پر قسم کی صورت میں دو طرح کے دلائل دیئے گئے۔ ایک تو وہ دلائل ہیں جنھیں اہل مکہ جانتے اور پہچانتے تھے اور ان کی آنکھیں انہیں دیکھتی تھیں۔ اور دوسرے وہ دلائل ہیں جنھیں وہ دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن دل اس کی گواہی دیتا تھا۔ پہلی قسم کی دلائل میں سے چند ایک کا ہم ذکر کرتے ہیں۔

۱- اس کلام کو ''محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)'' کے اسم گرامی سے پہچانی جانے والی جو ذات عزیز پیش کرتی ہے مکے کا ایک ایک فرد اس کی شرافتِ نفس، اس کی اخلاقی بلندی، اس کی امانت وصداقت اور اس کے حُسنِ کردار کا معترف تھا۔ کبھی کسی نے اس سے جھوٹ کا تجربہ نہیں کیا۔ ایسی ذات سے یہ توقع کیسے ہوسکتی ہے کہ وہ خداوندِ عالم پر جھوٹ باندھے اور غلط بات اس کی طرف منسوب کرے۔

۲- ہر سمجھدار آدمی اس بات کو جانتا تھا کہ قرآن کریم کو پیش کرنے میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کوئی ذاتی مفاد نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ قرآن کریم کی دعوت کو پیش کرنے کے نتیجہ میں کوئی مفاد تو کیا ہاتھ آتا، زندگی کے لالے ضرور پڑ گئے۔ کوئی دکھ ایسا نہیں جس سے اس راستے میں واسطہ پیش نہ آیا ہو۔ وہ معاشرہ جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سر آنکھوں پر بٹھاتا تھا وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بدترین دشمن ہوگیا۔ کیا کوئی شخص کسی غلط دعوے کے لیے اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی اور مستقبل کو داؤ پر لگا سکتا ہے۔

۳- مکے کے لوگ دیکھ رہے تھے کہ جو شخص اس دعوت کو قبول کرتا ہے اور اس کلام پر مبنی نظام زندگی کو اپنا رہنما بنا لیتا ہے، اس کی زندگی میں یک لخت ایک انقلاب برپا ہوجاتا ہے۔ کیا آج تک کسی شاعر یا کاہن کے کلام نے کہیں بھی کوئی صالح تبدیلی پیدا کی اور ایسے لوگ پیدا کیے ہیں جن کے اندر قربانی اور ایثار کی بے پناہ روح پیدا ہوجائے۔ اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر کیا اس کلام اور اس کے پیش کرنے والی کی سچائی میں شبہ کی کوئی گنجائش ہوسکتی ہے۔

۵- عرب کا ہر ذی فہم آدمی جانتا تھا کہ شعر کی زبان کیا ہوتی ہے اور کاہنوں کا کلام کیسا ہوتا ہے اور وہ شاعروں اور کاہنوں کی سیرت وکردار سے بھی ناواقف نہ تھے۔ تو کیا قرآن کریم کی زبان شاعری یا کہانت کی زبان ہے اور کیا اس دعوت کو پیش کرنے والی ذات گرامی شاعروں یا کاہنوں کی کمزوریوں کی حامل ہے؟

۵-قرآن کریم جس طرح کی دعوت پیش کررہا تھا، جس طرح کے تاریخی واقعات سے پردہ اٹھارہا تھا، جس طرح اخلاقی مسلمات پیش کررہا تھا اور جن علوم اور مضامین پر مشتمل تعلیم پیش کررہا تھا، ان میں سے کوئی بات بھی لوگوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان سے دعویٰ نبوت سے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ اور مکے بھر میں ایسے علمی سرمائے سے کوئی معمور نہ تھا جس سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کبھی استفادہ کرسکتے۔ اس کے باوجود آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک ایسا نظام زندگی جو ہر طرح کے اختلاف سے پاک، ایک ایسا نظام اخلاق جو انسانی آداب وخصائل کی اصلاح کا ضامن، ایک ایسا نظام عدالت جو زندگی کے ہر معاملے میں عدل واحسان کا مرقع اور ایک ایسا نظام عبادت جو شرک کی ہر آلودگی سے پاک اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا تصور دلوں میں راسخ کردینے والا انسانوں کو عطا کیا۔ یہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل نہیں ہوا تو اس کا سرچشمہ کہاں ہے۔ یہ تو وہ شواہد تھے جنھیں ہر دیکھنے والی نگاہ دیکھ سکتی اور ہر سمجھنے والی عقل باور کرسکتی تھی۔ لیکن کچھ حقائق ایسے ہیں جنھیں انسانی نگاہ دیکھ نہیں سکتی۔ مثلاً:

وہ یہ بات نہ دیکھ سکتے تھے اور نہ سمجھنے پر قادر تھے کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا خالق ومالک اور فرمانبرواہے۔ کائنات میں سب بندے ہی بندے ہیں، خدا اس کے سوا کوئی نہیں۔ قیامت ضرور برپا ہونے والی ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو واقعی اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول مقرر کیا ہے اور ان پر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے یہ قرآن نازل ہورہا ہے۔

یہ ہیں وہ دونوں قسم کے حقائق جن کی قسم کھا کر یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ رسولِ کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قول ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا کلام جسے ہمارے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کے بندوں تک پہنچایا ہے اور یہ نہ کسی شاعر کا کلام ہے اور نہ کسی کاہن کا کلام۔

''قَلِیْلاً مَّاتُؤْمِنُوْنَ'' اور ''قَلِیْلاً مَّاتَذَکَّرُوْنَ'' کا مفہوم:

مذکورہ آیات میں سے آخری آیات میں: ''قَلِیْلاً مَّاتُؤْمِنُوْنَ'' اور ''قَلِیْلاً مَّاتَذَکَّرُوْنَ'' فرمایا، ان دونوں جملوں میں قسموں کی صورت میں جو دلائل اور شواہد پیش فرمائے گئے ہیں، ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان دلائل کی موجودگی میں کوئی آدمی جس کے اندر شعور کی روشنی مری نہیں اور جس کے ضمیر کا نور بجھ نہیں گیا۔ اس حقیقت کو قبول کرنے سے انکار نہیں کرسکتا جسے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لے کر مبعوث ہوئے ہیں اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت اور قرآن کریم کی حقانیت میں کبھی شبہ کا اظہار نہیں کرسکتا، لیکن تمھاری مشکل یہ ہے کہ تم نے کبھی اپنے اندر ایمان کی خواہش اور بات سمجھنے کی طلب پیدا ہی نہیں ہونے دی۔ تمھاری طبیعت میں کبھی اس داعیے نے سر نہیں اٹھایا کہ مکے کا سب سے قابل فخر انسان جس کے سیرت وکردار کی پاکیزگی کی دشمن بھی گواہی دیتا ہے ایک حقیقت کا علم لے کر اٹھا ہے اور ہماری ہی بھلائی اور خیر خواہی کے لیے ہماری زبانوں کے تیر برداشت کررہا ہے، ہم کبھی تو اس کی بات سنیں اور کبھی اس کی دعوت پر غور کرکے دیکھیں، یہ ہے اصل وہ بیماری جس نے تمھیں آج تک اسلام سے دور رکھا ہے، ورنہ تمھارے لیڈر اور سردار ایسے

بدذوق اور بے دماغ نہیں تھے کہ وہ اگر سننے کی زحمت کرتے اور غور وفکر سے کام لیتے تو وہ اسلام کی حقانیت اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیغام کی عظمت کو سمجھنے سے قاصر رہتے۔ کیونکہ قرآن کریم جس زبان میں نازل ہوا ہے اور جس شان وشکوہ سے وہ دعوت کو پیش کرتا ہے اور جس بلند مقام سے انسانوں کو خطاب کرتا ہے اور اس کا پیش کرنے والا جس حُسنِ کردار کا حامل ہے اسے دیکھتے ہوئے تو یہ بات ناممکن دکھائی دیتی ہے کہ ایسی دلآویز شخصیت ایسے بلند پایہ کلام کو لوگوں کے سامنے پڑھے اور لوگ اس سے متاثر نہ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی کبھی کسی نے دل کی آمادگی سے اس کو سنا ہے بیشک اس کے اندر کی جاہلی عصبیت اور آباؤ اجداد کے دین کی عظمت اسے اسلام کی طرف نہ آنے دے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ قرآن کریم کی عظمت کا قائل نہ ہو۔

حضرت عمر فاروقؓ کے اسلام لانے سے متعلق مختلف روایات بیان کی گئی ہیں۔ یہ تمام روایات اپنے اپنے مقام پر صحیح ہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ ایک مضبوط شخصیت کے مالک تھے، وہ مختلف وقتوں میں اسلام سے متاثر ہوتے رہے، لیکن آغوشِ اسلام میں آنے کے لیے انہیں بہرحال وقت لگا۔ جن واقعات نے ان کے اندر اسلام کی تخم ریزی کی ان میں سے ایک واقعہ ایسا ہے جو پیش نظر آیات کریمہ سے تعلق رکھتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ انہیں گھر سے باہر رات گزارنی پڑی۔ وہ حرم تشریف لائے اور خانہ کعبہ کے پردے میں گھس گئے۔ اس وقت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نماز پڑھ رہے تھے اور ''سورۃ الحاقۃ'' کی تلاوت فرما رہے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ قرآن سننے لگے اور اس کی تالیف پر حیرت زدہ رہ گئے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے اپنے جی میں کہا ''خدا کی قسم یہ تو شاعر ہے جیسا کہ قریش کہتے ہیں۔'' لیکن اتنے میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ''وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ۔ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ۔'' (روح القرآن)

کاہن عرب میں وہ لوگ تھے جو بھوت پریت، جنوں اور چڑیلوں سے تعلق یا مناسب رکھتے تھے۔ وہ ان کو غیب کی بعض جزئی باتیں ایک مقفی و مسجع کلام کے ذریعہ سے بتلاتے تھے۔ لیکن جنوں کا کلام معجز نہیں ہوتا کہ ویسا دوسرا نہ کر سکے، بلکہ ایک جن کسی کاہن کو ایک بات سکھلاتا ہے دوسرا جن بھی ویسی بات دوسرے کاہن کو سکھلا سکتا ہے اور یہ کلام یعنی قرآن ایسا معجز ہے کہ سب جن وانس مل کر بھی اس کے مشابہ کلام نہیں بنا سکتے۔ دوسرے کاہنوں کے کلام میں محض قافیہ اور سجع کی رعایت کے لیے بہت الفاظ بھرتی کے بالکل بیکار اور بے فائدہ ہوتے ہیں، اور اس کلام معجز نظام میں ایک حرف یا ایک شوشہ بھی بیکار و بے فائدہ نہیں۔ پھر کاہنوں کی باتیں چند مبہم، جزئی اور معمولی خبروں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ لیکن علوم وحقائق پر مطلع ہونا اور ادیان وشرائع کے اصول وقوانین اور معاش معاد کے دستور وآئین کا معلوم کر لینا اور فرشتوں کے اور آسمانوں کے چھپے ہوئے بھیدوں پر سے آگاہی پانا ان سے نہیں ہوسکتا۔ بخلاف قرآن کریم کے وہ ان ہی مضامین سے پر ہے۔ (تفسیر عثمانی)

''تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَٰلَمِينَ'' (یہ اتارا ہوا ہے جہان کے رب کا۔)

ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ قرآن مجید تو اللہ کا کلام ہے جیسا کہ آپ ہی فرماتا ہے: ''تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَٰلَمِينَ'' کہ

یہ رب العالمین کا نازل کیا ہوا ہے۔ کلام اپنے متکلم کی شان خود بیان کر دیتا ہے۔ شہوت پرستوں، عیاشوں کا کلام ویسا ہی ہوتا ہے۔ بادشاہوں کے کلام میں شان وشوکت نمایاں ہوتی ہے۔ حکیموں کے کلام میں حکمت کے انوار چمکا کرتے ہیں۔ اب قرآن کا شان وانداز کہے دیتا ہے کہ یہ رب العالمین کا کلام ہے۔ ہر قوم و ہر ملک کے لوگوں کو اسی شان ربوبیت سے مامور کرتا ہے۔ بلا لحاظ شرافت خاندانی و دولتمندی ہر ایک کو انہیں بزرگی بھرے لفظوں سے مغفرت کا وعدہ اور سزا کی خبر دیتا ہے۔ پھر جب یہ اللہ کا کلام ہے تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) و جبرئیل (علیہ السلام) کا کلام کیونکر کہہ دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اضافت کے لیے ادنیٰ ملابست اور تھوڑا سا علاقہ بھی کافی ہوتا ہے۔ خود بادشاہ نوکر سے کہہ دیا کرتا ہے، تم اپنے ملک میں ایسا کرو، اپنے گھوڑوں کو یوں رکھو، حالانکہ ملک اور گھوڑے بادشاہ کے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید دراصل کلام الٰہی ہے مگر عالم ملکوت سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک لانے میں جبرئیل (علیہ السلام) واسطہ ہیں، اس لیے ان کا کلام کہہ دینا ٹھیک ہے۔ وہی اپنی زبان سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تلقین کرتے ہیں اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی زبان مبارک سے امت کو سناتے ہیں اس لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کلام کہہ دینا بھی بے جا نہیں۔ (حقانی)

''وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ۔ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ۔ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ'' (اور اگر یہ بنا لاتا ہم پر کوئی بات۔ تو ہم پکڑ لیتے اس کا داہنا ہاتھ۔ پھر کاٹ ڈالتے اس کی گردن)

''تَقَوَّلَ'' کے معنی بات گھڑنے کے ہی اور ''وَتِينَ'' قلب سے نکلنے والی وہ رگ ہے۔ جس سے روح جسم انسانی میں پھیلتی ہے اس کے قطع کر دینے سے موت فوراً واقع ہو جاتی ہے۔ (معارف) ابن قتیبہ و مبرد و زجاج کہتے ہیں کہ ''يَمِينِ'' کے معنی ہیں ''قوت'' کے، یعنی ہم اس کو مضبوطی سے پکڑتے کہ سرکنے نہ پاتا۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ عرب میں دستور تھا کہ جب مجرم کو قتل کرتے تھے تو اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے تھے کہ کچھ نہ کر سکے۔ پھر اس کی گردن مار دیتے تھے۔ اس طریقے کے موافق رسول کی نسبت کلام کیا گیا۔ اور ''لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ'' کے معنی بھی ابن قتیبہ کے نزدیک یہ ہیں کہ ہلاک کر دیتے، خاص گردن مار دینا مراد نہیں۔ (حقانی)

کفار کا الزام یہ تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے رسول نہیں اور نہ ان پر کلام خداوندی نازل ہوتا ہے، بلکہ یہ اپنی طرف سے کچھ باتیں گھڑ لیتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو سناتے ہیں۔ اس الزام کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یقیناً اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ رہی یہ بات کہ وہ اپنی طرف سے کچھ باتیں گھڑ کر اللہ تعالیٰ کے کلام کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں، یہ انتہائی جہالت اور حماقت کی بات ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو اپنا رسول اور سفیر بناتا ہے اور اس پر اپنا کلام اتارتا ہے تو اس کی انتہائی کڑی نگرانی بھی کرتا ہے۔ اس کی یہ مجال نہیں کہ وہ اس میں کوئی ردوبدل کر سکے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام وہ خزانہ ہے جس سے پوری نوع انسانی کی بھلائی وابستہ ہے۔ جس گھر میں یہ خزانہ رکھا گیا ہے، اس گھر کو حفاظت کے بغیر تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو معصوم پیدا فرماتا ہے۔ ان کے دل میں کبھی یہ

خیال بھی پیدا نہیں ہوسکتا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے حوالے سے کوئی غلط بات کہیں، لیکن بفرضِ محال یہ تصور کر بھی لیا جائے کہ اس کے رسول نے اپنی طرف سے کوئی بات بنانے کی کوشش کی ہے تو اللہ تعالیٰ کا ضابطہ اس معاملے میں ایسا شدید ہے کہ فوراً اس کی قدرت حرکت میں آتی ہے اور اپنے رسول کا دایاں ہاتھ پکڑ کر اسے گرفتار کرتی ہے اور پھر اس کی شہ رگ کاٹ دیتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کمی بیشی کرنا اس درجے کا جرم ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا رسول بھی اس جرم کا ارتکاب کرے تو اس کی بھی شہ رگ کاٹ دی جائے۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ کا رسول کبھی اس طرح کی بات کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ کفار کے اعتراض کا جواب دینے کے لیے پروردگار نے اپنے کلام کی حفاظت کا جو انتظام کر رکھا ہے نہایت تیکھے لہجے میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔

جس ضابطے کا یہاں ذکر فرمایا گیا ہے اس کا تعلق کسی خاص رسول سے نہیں، بلکہ ہر دور میں جب بھی اللہ تعالیٰ کا کوئی رسول آیا اور اس پر وحیِ الٰہی کا نزول ہوا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اسی سخت گیری کے ساتھ اپنے دین کی حفاظت فرمائی ہے۔ اب جبکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر دین اسلام کی تکمیل کی جارہی ہے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد کوئی رسول آنے والا نہیں، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لوگوں کے سامنے اپنی طرف سے کلام خداوندی میں کمی بیشی کرتے یا اپنے کلام کو اللہ تعالیٰ کے کلام کے طور پر پیش کرتے۔ اور اگر خدانخواستہ ایسا ہوتا تو ہم ان کی شہ رگ کاٹ دیتے اور تم میں سے کسی کو بھی ان کو بچانے کی جرأت نہ ہوتی۔ لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ وہ نہایت جانفشانی اور اللہ تعالیٰ کے اعتماد پر تمھارے سامنے اللہ تعالیٰ کا کلام پیش کررہے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسولِ برحق ہیں اور وہ جس چیز کو پیش کررہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے۔

یاد رہے کہ بعض نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں نے اس آیت کو بطورِ دلیل پیش کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے سچے نبی نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ اپنے قانون کے مطابق ہماری گردن توڑ دیتا۔ لیکن یہ بات ایک سیدھی سادی بات کو الجھا دینے کی کوشش کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس آیت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ کوئی اللہ تعالیٰ کا سچا رسول کبھی وحیِ الٰہی میں پیوندکاری نہیں کرتا، اور نہ اپنے کلام کو کلام خداوندی کے طور پر پیش کرتا ہے اور اگر وہ ایسا کرے تو ہم اس کی گردن کاٹ دیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو شخص بھی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے اور خدا پر جھوٹ باندھے تو اس کی گردن توڑ دی جائے۔ کیونکہ بہت سے لوگ ایسے گزرے ہیں جو نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرتے رہے اور ایسے بھی لوگ گزرے جو خدا کو گالیاں دیتے رہے۔ لیکن قدرت نے ہمیشہ ان کو مہلت دی اور سزا کے لیے انہیں آخرت کے حوالے کردیا۔ لیکن سچے رسول کی صداقت اور حقانیت پر چونکہ نوعِ انسانی کی بھلائی کا دارومدار ہے اور اس کی معمولی بھول چوک بھی فتنے کا باعث ہوسکتی ہے۔ اس لیے پروردگار فوراً اس کی اصلاح فرماتے ہیں اور ہر ممکن طریقے سے اپنے رسول اور اپنے پیغام کی نگہداشت کرتے ہیں۔ (روح القرآن)

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ اگر رسول بالفرض کوئی حرف اللہ کی طرف منسوب کر

دے یا اس کے کلام میں اپنی طرف سے ملا دے جو اللہ نے نہ کہا ہو تو اسی وقت اس پر یہ عذاب کیا جائے (العیاذ باللہ) کیونکہ اس کی تصدیق اور سچائی آیات بینات اور دلائل و براہین کے ذریعہ سے ظاہر کی جا چکی ہے۔ اب اگر اس قسم کی بات پر فوراً عذاب اور سزا نہ کی جائے تو وحی الٰہی سے امن اٹھ جائے گا اور ایسا التباس و اشتباہ پڑ جائے گا جس کی اصلاح ناممکن ہو جائے گی۔ جو حکمت تشریع کے منافی ہے۔ بخلاف اس شخص کے جس کا رسول ہونا آیات و براہین سے ثابت نہیں ہوا، بلکہ کھلے ہوئے قرائن و دلائل اعلانیہ اس کی رسالت کی نفی کر چکے ہیں تو اس کی بات بھی بیہودہ اور خرافات ہے کوئی عاقل اس کو درخور اعتناء نہ سمجھے گا اور نہ بحمد اللہ دین الٰہی میں کوئی التباس و اشتباہ واقع ہوگا۔

ہاں ایسے شخص کی معجزات وغیرہ سے تصدیق ہونا محال ہے، ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو جھوٹا ثابت کرنے اور رسوا کرنے کے لیے ایسے امور بروئے کار لائے جو اس کے دعوئے رسالت کے مخالف ہوں۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ جس طرح بادشاہ ایک شخص کو کسی منصب پر مامور کر کے اور سند و فرمان وغیرہ دے کر کسی طرف روانہ کرتے ہیں۔ اب اگر اس شخص سے اس خدمت میں کچھ خیانت ہوئی یا بادشاہ پر کچھ جھوٹ باندھنا اس سے ثابت ہوا، تو اسی وقت بلا توقف اس کا تدارک کرتے ہیں۔ لیکن اگر سڑک کوٹنے والا مزدور یا جھاڑو دینے والا بھنگی بکتا پھرے کہ گورنمنٹ کا میرے لیے یہ فرمان ہے یا میرے ذریعہ سے یہ احکام دیے گئے ہیں تو کون اس کی بات پر کان دھرتا ہے اور کون اس کے دعووں سے تعرض کرتا ہے۔ بہر حال آیت ہذا میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت پر استدلال نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ بتلایا گیا ہے کہ قرآن کریم خالص اللہ کا کلام ہے جس میں ایک حرف یا ایک شوشہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی اپنی طرف سے شامل نہیں کر سکتے۔ اور نہ باوجود پیغمبر ہونے کے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یہ شان ہے کہ کوئی بات اللہ کی طرف منسوب کر دیں جو اس نے نہ کہی ہو۔ تورات سفر استثناء کے اٹھارویں باب میں بیسواں فقرہ یہ ہے ''لیکن وہ نبی ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے''۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو نبی ہوگا اس سے ایسا ممکن نہیں: ''وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ'' البقرۃ: ۱۲۰۔ (عثمانی)

''فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِينَ'' (پھر تم میں کوئی ایسا نہیں جو اس سے بچا لے)

یعنی اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی طرف سے کچھ کہتے اور ہماری طرف منسوب کرتے، جیسا کہ منکرین نبوت کا شبہ ہے تو ہم ان کو ضرور ہلاک کر دیتے، سرسبز نہ ہونے دیتے۔ (اور تم میں سے کوئی ایسا نہیں جو ان کو میری پکڑ اور عذاب سے بچا لیتا) مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اظہار نبوۃ کے بعد سرسبز ہوتے گئے، روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ ان کے خلفاء کے عہد میں عرب کے ریگستان سے نکل کر مشرق و مغرب میں کس شان و شوکت اور آسمانی برکت کے ساتھ اسلام پھیلا اور جاہل وحشی قوموں پر سایہ افگن ہوا۔ اور جس نے اس کو نہیں مانا بہت جلد خوار و ذلیل یا دل میں پشیمان ہوا۔ ان باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ قرآن پرہیزگاروں، خداترس لوگوں کے لیے نصیحت و پند ہے۔ اس میں کہانت اور شاعری اور شہوانی کون سی بات ہے۔ (حقانی)

مضامین ومقالات

مسواک اوراس کے دینی وطبی فوائد
قرآن وحدیث اورجدید سائنس کی روشنی میں

مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی

اسلام ایک ایسا دین ہے جس نے انسان کی زندگی کو محض عبادات اور روحانی اعمال تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کے جسم، لباس، رہن سہن، خوراک، صفائی، صحت اور معاشرتی زندگی کے بارے میں بھی رہنمائی فراہم کی ہے۔ پاکیزگی اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے اور قرآن مجید نے بارہا طہارت اور پاکیزگی کو پسندیدہ عمل قرار دیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

"إِنَّ اللهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ" (سورۃ البقرۃ: ۲۲۲)

(بے شک اللہ بہت توبہ کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔)

اسی طرح ایک دوسری آیت میں ارشاد پاک ہے:

"وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ" (سورۃ المدثر: ۴)

(اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔)

اگرچہ قرآن مجید میں "مسواک" کا لفظ صراحت کے ساتھ مذکور نہیں، لیکن پاکیزگی اور طہارت کا جو عمومی اصول قرآن نے بیان کیا ہے، رسول اللہ ﷺ کی سنت میں اس کی عملی صورتیں واضح طور پر ملتی ہیں۔ مسواک انہی عملی تعلیمات میں سے ایک نہایت اہم سنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مسواک کو منہ کی پاکیزگی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا ذریعہ قرار دیا اور امت کو اس کی بار بار ترغیب دی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"السِّوَاكُ مَطْهَرَةٌ لِلْفَمِ، مَرْضَاةٌ لِلرَّبِّ" (سنن النسائی، کتاب الطهارة، رقم: ۵)

(مسواک منہ کی پاکیزگی کا ذریعہ اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب ہے۔)

یہ حدیث مسواک کی حقیقت کو نہایت جامع انداز میں بیان کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے دو بنیادی فائدے بیان فرمائے: ایک "مَطْهَرَةٌ لِلْفَمِ"، یعنی منہ کی پاکیزگی، اور دوسرا "مَرْضَاةٌ لِلرَّبِّ"، یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا۔ اس طرح مسواک میں جسمانی صفائی اور روحانی اجر دونوں جمع ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے مسواک کی اہمیت کو مزید واضح کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے:

"لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ مَعَ كُلِّ صَلَاةٍ" (البخاری، الجمعة، رقم: ۸۸۷، و

مسلم، الطهارة، رقم: ۲۵۲)

(اگر مجھے اپنی امت پر مشقت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں انہیں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔)

اس حدیث سے مسواک کی اہمیت کا اندازہ اس طور پر لگایا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے ہر نماز کے ساتھ مربوط فرمایا۔ اگر امت پر مشقت کا اندیشہ نہ ہوتا تو آپ ﷺ ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتے۔ معلوم ہوا کہ منہ کی صفائی اسلام میں محض ظاہری آرائش نہیں، بلکہ عبادت کے آداب اور پاکیزگی کا اہم حصہ ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

"أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا دَخَلَ بَيْتَهُ بَدَأَ بِالسِّوَاكِ" (صحیح مسلم، الطهارة، رقم: ۲۵۳)

(نبی کریم ﷺ جب اپنے گھر میں داخل ہوتے تو مسواک سے ابتدا فرماتے۔)

یہ روایت مسواک کے ایک اور اہم پہلو کو سامنے لاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب گھر میں داخل ہوتے، اس وقت بھی مسواک کا اہتمام فرماتے تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ منہ کی صفائی صرف مسجد، نماز یا کسی خاص عبادت کے لیے ہی نہیں ہے، بلکہ انسان کی روزمرہ زندگی، اہلِ خانہ سے ملاقات اور معاشرتی تعلقات کا بھی حصہ ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب رات کو بیدار ہوتے تو مسواک سے اپنا منہ صاف فرماتے تھے۔ (صحیح البخاری، کتاب الوضوء؛ و صحیح مسلم، کتاب الطهارة) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیند کے بعد منہ کی صفائی کا اہتمام بھی سنتِ نبوی ﷺ میں شامل تھا۔

مسواک عربی زبان کے لفظ "سواک" سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں رگڑنا، ملنا۔ اور مسواک کے معنی ہیں: دانت صاف کرنے کی لکڑی۔ (مصباح اللغات)

برصغیر، عرب اور افریقہ کے مختلف علاقوں میں صدیوں سے مختلف درختوں کی ٹہنیوں یا جڑوں کو دانت صاف کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے، تاہم جدید سائنسی تحقیقات میں جس مسواک پر سب سے زیادہ تحقیق ہوئی ہے وہ "اَراک" یا "پیلو" کے درخت سے حاصل ہونے والی مسواک ہے، جس کا سائنسی نام Salvadora persica ہے۔ اسے انگریزی میں عموماً Miswak یا Chewing Stick کہا جاتا ہے۔

جدید سائنسی تحقیق نے مسواک کے اندر موجود قدرتی اجزا اور اس کے دانتوں و مسوڑھوں پر اثرات کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے۔ 2020ء میں شائع ہونے والے ایک تحقیقی جائزے میں مسواک سے متعلق متعدد تجرباتی اور طبی تحقیقات کا تجزیہ کیا گیا۔ اس جائزے کے مطابق مسواک کے استعمال سے دانتوں پر جمنے والی جراثیمی تہہ، مسوڑھوں کی سوزش اور دانتوں کے گلنے سڑنے کے امکانات میں کمی کے سلسلے میں مثبت نتائج سامنے آئے ہیں۔ بعض تحقیقات میں مسوڑھوں کے زخم بھرنے اور منہ کی مجموعی صحت کے لیے بھی مفید اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔

دانتوں پر خوراک کے ذرات، لعاب اور جراثیم کے مسلسل جمع ہونے سے ایک چپچپی جراثیمی تہہ تشکیل پاتی ہے، جسے سائنسی زبان میں ''دندانی تہہ'' (Dental Plaque) کہا جاتا ہے۔ اگر اسے باقاعدگی سے صاف نہ کیا جائے تو یہ دانتوں کی خرابی اور مسوڑھوں کی سوزش کا سبب بن سکتی ہے۔ مسواک اس تہہ کو دو طریقوں سے کم کرنے میں مدد دیتی ہے۔ ایک اس کے ریشوں کی میکانی صفائی کے ذریعے اور دوسرے اس میں موجود قدرتی کیمیائی اجزا کے ذریعے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں حدیثِ نبوی ﷺ کے الفاظ ''اَلسِّوَاکُ مَطْهَرَةٌ لِلْفَمِ'' کی معنویت مزید نمایاں ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مسواک کو منہ کی پاکیزگی کا ذریعہ قرار دیا، اور جدید تحقیق نے بھی اس کے منہ کی صفائی سے متعلق متعدد مفید اثرات کی تصدیق کی ہے۔

یاد رہے کہ سائنسی تحقیقات کے نتائج کو ان کے اصل حدود میں رکھنا ضروری ہے اور یہ دعویٰ مناسب نہ ہوگا کہ ہر جدید طبی فائدہ حدیث میں صراحتاً بیان ہو چکا تھا۔ حدیث کا مقام وحی اور سنت کا ہے جو قطعیت کا فائدہ دیتی ہے اور اس کا دائرہ احکام شریعت کا بیان اور وضاحت ہے، نہ کہ طبی و سائنسی فوائد کا بیان۔ جبکہ سائنس مشاہدے، تجربے اور تحقیق کے ذریعے جسمانی اثرات کا مطالعہ کرتی ہے۔

2021ء میں جرنل آف ایتھنو فارماکولوجی میں شائع ہونے والے ایک منظم تحقیقی جائزے اور جامع تجزیے میں Salvadora persica کی مسواک کا عام دانت صاف کرنے والے برش کے ساتھ تقابلی مطالعہ کیا گیا۔ متعدد تحقیقات کے نتائج کو جمع کر کے دیکھا گیا کہ مسواک دانتوں پر جمنے والی جراثیمی تہہ اور مسوڑھوں کی سوزش پر کس حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔ تحقیق کے نتائج سے معلوم ہوا کہ مسواک پلاک کو کم کرنے میں عام دانت صاف کرنے والے برش کے ساتھ قابلِ تقابل اثر رکھتی ہے، جبکہ مسوڑھوں کی سوزش کم کرنے میں بھی اس کے مفید اثرات سامنے آئے۔

2022ء میں شائع ہونے والے ایک اور جامع تحقیقی جائزے میں بالغ افراد پر کیے گئے باقاعدہ طبی تجربات کا تجزیہ کیا گیا۔ اس میں بھی یہ نتیجہ سامنے آیا کہ مسواک کے ذریعے دانتوں پر جمنے والی جراثیمی تہہ اور مسوڑھوں کی سوزش میں کمی واقع ہو سکتی ہے اور اکیلے استعمال کی صورت میں اس کا اثر عام دانت صاف کرنے والے برش کے ساتھ قابلِ تقابل پایا گیا۔ مزید یہ کہ جب مسواک کو، دانت صاف کرنے والے برش کے ساتھ اضافی طور پر استعمال کیا گیا تو بعض نتائج میں جراثیمی تہہ اور مسوڑھوں کی سوزش میں مزید بہتری دیکھی گئی۔

مسواک کے فوائد صرف اس کے ریشوں کی صفائی تک محدود نہیں۔ ''اَراک'' کے درخت میں مختلف قدرتی کیمیائی اجزا پائے جاتے ہیں، جن پر سائنسی تحقیق کی گئی ہے۔ ان اجزا میں بعض ایسے مرکبات شامل ہیں، جن کے بارے میں تجرباتی مطالعات نے جراثیم کی افزائش کو محدود کرنے، سوزش کم کرنے اور دانتوں کے ماحول کو بہتر بنانے کے امکانات ظاہر کیے ہیں۔ 2020ء کے ایک جامع تحقیقی جائزے میں مسواک کے متعلق موجود مطالعات میں جراثیم مخالف، مسوڑھوں کی

سوزش کم کرنے والے اور دانتوں کی خرابی سے بچاؤ میں معاون اثرات کی متعدد مثالیں بیان کی گئی ہیں۔

یہاں ایک اہم بات سمجھنا ضروری ہے کہ ''جراثیم کش'' ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ مسواک منہ کے تمام جراثیم کو ختم کر دیتی ہے۔ انسانی منہ میں بے شمار اقسام کے جراثیم قدرتی طور پر موجود ہوتے ہیں اور ان میں سے بہت سے انسانی جسم کے معمول کے حیاتیاتی نظام کا حصہ ہیں۔ صحت مند منہ کا مقصد ہر جرثومے کو ختم کرنا نہیں بلکہ نقصان دہ جراثیم کی افزائش کو قابو میں رکھنا، دانتوں کی سطح کو صاف رکھنا اور مسوڑھوں کو صحت مند رکھنا ہے۔ مسواک کے بارے میں دستیاب تحقیق اسی وسیع مفہوم میں اس کے فوائد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

مسوڑھوں کی سوزش کو طبّی زبان میں ''جنجیوائٹس'' (Gingivitis) کہا جاتا ہے۔ اس کی ابتدائی صورت میں مسوڑھے سرخ، حساس یا سوجے ہوئے ہو سکتے ہیں اور برش یا صفائی کے وقت خون بھی آ سکتا ہے۔ اگر منہ کی صفائی مسلسل ناقص رہے تو بعض افراد میں یہ مسئلہ مزید بڑھ کر دانتوں کے گرد موجود بافتوں کی بیماری کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ مسواک پر کیے گئے کئی طبی مطالعات میں مسوڑھوں کی صحت اور سوزش کے اشاریوں میں بہتری دیکھی گئی ہے۔ 2021ء اور 2022ء کے جامع تحقیقی تجزیوں نے بھی اس سلسلے میں مسواک کے مفید اثرات کی تائید کی ہے۔

مسواک کے سلسلے میں اسلام اور سائنس کا تقابلی مطالعہ کرتے وقت ایک نہایت اہم علمی اصول سامنے رکھنا چاہیے۔ اسلام نے مسواک کا حکم یا ترغیب سائنس کے تجربات کے نتائج کی بنیاد پر نہیں دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت اپنی حجت میں سائنسی تجربے کی محتاج نہیں۔ مسواک ایک سنت ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اسے اختیار فرمایا اور اس کی ترغیب دی۔ بعد میں سائنس نے اس کے جسمانی اثرات کا مطالعہ کیا اور اس کے کئی فوائد کے شواہد سامنے آئے۔ اس لیے درست تعبیر یہ ہے کہ جدید سائنس نے مسواک کے متعدد طبی فوائد کی تائید کی ہے، نہ کہ یہ کہ مسواک کی سنت کی صحت سائنس نے ثابت کی ہے۔

یہ فرق اس لیے بھی ضروری ہے کہ سائنسی تحقیقات وقت کے ساتھ بہتر اور زیادہ دقیق ہوتی رہتی ہیں۔ آج کسی اثر کے بارے میں مضبوط شواہد موجود ہو سکتے ہیں، جبکہ مستقبل کی تحقیق اس کے کسی پہلو کو مزید واضح یا محدود کر سکتی ہے۔ اس کے برعکس سنتِ رسول ﷺ کا دینی مقام اپنی جگہ مستقل ہے۔ اس لیے اسلام اور سائنس کے درمیان صحیح تقابلی مطالعہ وہی ہے، جس میں دونوں کے دائرۂ کار کو ملحوظ رکھا جائے۔

مسواک کی ایک نمایاں خصوصیت اس کی سادگی ہے۔ ایک چھوٹی سی قدرتی ٹہنی جسے کسی پیچیدہ مشین یا بجلی کی ضرورت نہیں، منہ اور دانتوں کی صفائی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ 2020ء کے تحقیقی جائزے میں بھی اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی کہ کم قیمت اور آسان دستیابی کی وجہ سے قدرتی مسواک آج بھی دنیا کے مختلف علاقوں میں استعمال ہوتی ہے۔

اسلامی تعلیمات کی جامعیت کا ایک خوب صورت پہلو یہ ہے کہ ایک معمولی جسمانی عمل بھی نیت کے ذریعے عبادت بن سکتا ہے۔ انسان اگر مسواک اس نیت سے کرتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کرے گا، اپنے منہ کو

پاک رکھے گا اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرے گا تو ایک سادہ سا روزمرہ کا عمل روحانی اجر کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسواک کو صرف طبی یا ظاہری صفائی کے طور پر بیان نہیں کیا، بلکہ اسے ''مَرْضَاۃٌ لِلرَّبِّ'' یعنی رب کی رضا کا ذریعہ بھی قرار دیا۔

نماز سے پہلے مسواک کی ترغیب میں بھی اسلام کے جامع تصورِ پاکیزگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ مسلمان نماز کے لیے وضو کرتا ہے، جسم اور لباس کی پاکیزگی کا اہتمام کرتا ہے، پھر مسواک کے ذریعے منہ کی صفائی بھی کرتا ہے۔ یوں ظاہری پاکیزگی عبادت کی روحانی تیاری کا حصہ بن جاتی ہے۔ جدید طب کی نظر سے بھی نماز سے پہلے یا دن کے مختلف اوقات میں منہ کی صفائی ایک صحت مند عادت ہے، لیکن اسلام نے اسے اس سے کہیں وسیع مفہوم میں سنت اور عبادت سے جوڑ دیا ہے۔

یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ مسواک کو، دانتوں کے برش کا مخالف سمجھنا درست نہیں۔ اگر کوئی شخص مسواک کے ساتھ دانتوں کا برش بھی استعمال کرتا ہے تو یہ سنت کی مخالفت نہیں۔ بلکہ جدید تحقیقات میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ مسواک کو دانتوں کے برش کے ساتھ اضافی طور پر استعمال کرنے سے بعض افراد میں پلاک اور مسوڑھوں کی سوزش کے حوالے سے مزید فائدہ ہوسکتا ہے۔ 2022ء کے جامع تجزیے میں مسواک کے اضافی استعمال کے سلسلے میں یہی نتیجہ سامنے آیا۔

اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں کہ مسواک ہر صورت میں دانتوں کے ڈاکٹر، دانتوں کے برش یا طبی علاج کا مکمل متبادل ہے۔ دانتوں کی بیماری، شدید مسوڑھوں کی سوزش، دانت میں سوراخ، انفیکشن یا کسی دوسرے مرض کی صورت میں ماہرِ دندان سے مشورہ اور مناسب علاج ضروری ہے۔ مسواک ایک مفید صفائی کا ذریعہ اور سنت ہے، لیکن اسے ہر قسم کے دندانوی علاج کا متبادل قرار دینا سائنسی طور پر درست نہیں۔

مسواک کے درست استعمال کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ بہت سختی سے دانتوں کو رگڑنا یا مسوڑھوں پر ضرورت سے زیادہ دباؤ ڈالنا نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ مسواک کا مقصد صفائی ہے، دانتوں یا مسوڑھوں کو زخمی کرنا نہیں۔ اسی لیے نرمی، اعتدال اور مناسب طریقے سے استعمال ضروری ہے۔ جدید تحقیقی مطالعات میں بھی مسواک کے استعمال کے طریقے اور اس کی مقدار کے بارے میں مزید معیاری تحقیقات کی ضرورت کی نشاندہی کی گئی ہے۔

مسواک کی سنت ہمیں اسلام کے اس جامع تصور کی طرف متوجہ کرتی ہے جس میں عبادت اور صحت، روحانیت اور جسمانیت، پاکیزگی اور معاشرت ایک دوسرے سے جدا نہیں۔ ایک مسلمان جب مسواک کرتا ہے تو وہ بیک وقت اپنے منہ کی صفائی، سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت کرسکتا ہے۔ یہی وہ جامع تربیت ہے جو اسلامی تعلیمات کو محض نظریاتی احکام کا مجموعہ نہیں رہنے دیتی بلکہ انہیں روزمرہ زندگی کے عملی معمولات میں تبدیل کردیتی ہے۔

(سائنسی حوالہ جات میں نوردین اور دیگر محققین کی 2020ء کی تحقیق ''An evid:Miswak and oral health'')

حضرت مولانا سعید الرحمن اعظمی ندویؒ

حیات وعلمی، دینی وادبی خدمات

مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی

دنیائے علم وادب کی معروف شخصیت، عربی زبان وادب کے ممتاز عالم، صاحبِ قلم مصنف، صحافی، داعی، مدرس اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے طویل عرصے تک مہتمم رہنے والے حضرت مولانا سعید الرحمن اعظمی ندویؒ آج (۲۵ ربیع الآخر ۱۴۴۸ھ، مطابق ۷ اکتوبر ۲۰۲۶، بروز بدھ) اس دارِفانی سے رخصت ہوگئے۔ ان کے انتقال کی خبر نے علمی، دینی اور ادبی حلقوں میں گہرے رنج والم کی کیفیت پیدا کردی۔ وہ ان اہلِ علم میں سے تھے جنہوں نے اپنی پوری زندگی کسی ایک شعبے تک محدود نہیں رکھی بلکہ تدریس، تصنیف، صحافت، دعوت، عربی زبان وادب اور ادارہ جاتی خدمت کے متعدد میدانوں میں اپنی یادگار خدمات انجام دیں۔

حضرت مولانا سعید الرحمن اعظمی ندویؒ 1935ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے جامعہ مفتاح العلوم، مئو سے علمی فراغت حاصل کرنے کے بعد، 1952ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کا رخ کیا، جہاں آپ نے اس زمانے کے ممتاز اساتذہ سے علم وادب کی تحصیل کی۔ مولانا شاہ محمد حلیم عطا سلونویؒ، مولانا ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاویؒ، ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ جیسے اساتذہ سے استفادہ نے آپ کی علمی شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

1954ء میں ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد مولانا اعظمی ندویؒ اسی ادارے سے بحیثیت مدرس وابستہ ہوگئے۔ یہ وابستگی چند برسوں یا چند عشروں کی نہیں تھی بلکہ تقریباً پوری زندگی پر محیط رہی۔ انہوں نے ندوہ کے علمی ماحول میں تدریس کے ذریعے طلبہ کی متعدد نسلوں کی تربیت کی۔ عربی زبان وادب پر ان کی غیر معمولی گرفت، زبان کے اسالیب سے واقفیت اور عربی تحریر میں قدرت نے انہیں اپنے دور کے ممتاز عربی اساتذہ میں شامل کردیا۔

ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو عربی زبان وادب کی خدمت تھا۔ انہوں نے عربی کو صرف ایک نصابی زبان کے طور پر نہیں برتا بلکہ اسے دعوت، صحافت اور اسلامی فکر کی ترجمانی کا ذریعہ بنایا۔ ان کی عربی تحریروں کے ذریعے ہندوستان کے علمی حلقوں کی آواز عالمِ عرب تک پہنچی اور عرب دنیا میں ہندوستانی علماء اور خصوصاً ندوۃ العلماء کی علمی روایت کا تعارف مضبوط ہوا۔

ان کی زندگی کا ایک نہایت اہم باب عربی رسالہ ''البعث الاسلامی'' ہے۔ یہ رسالہ 1955ء میں مولانا سید محمد الحسنیؒ نے جاری کیا تھا۔ مولانا سعید الرحمن اعظمی ندویؒ آغاز ہی سے اس کے ساتھ شریکِ ادارت کی حیثیت سے وابستہ

رہے۔مولانا سید محمد الحسنیؒ کی وفات کے بعد مولانا اعظمی ندویؒ نے رسالے کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی اور طویل عرصے تک اسے علمی وفکری قوت فراہم کرتے رہے۔

''البعث الاسلامی'' کے ذریعے ہندوستان سے عالم عرب تک اسلامی فکر، دینی علوم اور علمی مباحث پہنچتے رہے۔اس رسالے نے ہندوستانی علماء اور عرب دنیا کے درمیان علمی رابطے کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کیا، اور مولانا سعید الرحمن اعظمی ندویؒ نے اس علمی وفکری خدمت کو اپنی زندگی کا ایک اہم حصہ بنایا۔

مولانا اعظمی ندویؒ کو مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی خصوصی علمی وفکری سرپرستی بھی حاصل رہی۔حضرت علی میاں ندویؒ سے ان کا تعلق محض استاذ وشاگرد کا تعلق نہیں تھا بلکہ اس میں شفقت، اعتماد اور طویل علمی رفاقت کے پہلو بھی شامل تھے۔حضرت علی میاں ندویؒ کی شخصیت اور افکار سے مولانا اعظمی ندویؒ نے گہرا استفادہ کیا اور ان کے علمی و دعوتی مشن کو قریب سے دیکھا۔

حضرت علی میاں ندویؒ سے ان کی طویل علمی وابستگی کا ایک قیمتی ثمر ان کی معروف کتاب ''48 سال شفقتوں کے سائے میں'' ہے۔اس کتاب میں انہوں نے حضرت علی میاں ندویؒ کی شخصیت، ان کے علمی ودعوتی مزاج اور ان کے ساتھ اپنے طویل تعلق کے متعدد پہلو محفوظ کیے۔یہ کتاب ایک پورے علمی عہد کی یادوں اور مشاہدات کا قیمتی سرمایہ ہے۔

مولانا سعید الرحمن اعظمی ندویؒ خود بھی صاحبِ تصنیف تھے۔ان کے قلم سے مختلف علمی، دینی، ادبی اور شخصی موضوعات پر متعدد کتابیں اور مضامین سامنے آئے۔ان کی تحریروں میں علم کی گہرائی، عربی زبان پر قدرت، مطالعے کی وسعت اور اسلامی فکر سے گہری وابستگی نمایاں ہوتی ہے۔ان کی تصنیفات ان کے علمی ذوق اور وسیع مطالعے کی آئینہ دار ہیں۔ان کی شخصیت صرف ایک مدرس یا مصنف کی نہیں تھی؛ وہ ایک صاحبِ فکر عالم بھی تھے۔ان کے یہاں قدیم علمی روایت اور جدید دور کے تقاضوں کے درمیان ربط پیدا کرنے کی کوشش نمایاں تھی۔وہ عربی زبان کے ذریعے عالمِ اسلام سے مضبوط تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے دینی وتعلیمی ماحول کی ضرورتوں سے بھی پوری طرح واقف تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی خدمات کا دائرہ درس گاہ سے نکل کر صحافت، دعوت اور بین الاقوامی علمی روابط تک پھیل گیا۔

2000ء میں مولانا سعید الرحمن اعظمی ندویؒ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم مقرر ہوئے۔یہ منصب ندوۃ العلماء جیسے تاریخی اور بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ادارے میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔انہوں نے اس ذمہ داری کو طویل عرصے تک نبھایا اور اپنی انتظامی بصیرت، علمی تجربے اور ادارے سے گہری وابستگی کے ذریعے ندوہ کی خدمت جاری رکھی۔

ان کی زندگی کا ایک بڑا وصف یہ بھی تھا کہ انہوں نے ندوۃ العلماء کے ساتھ اپنی وابستگی کو محض ملازمت یا منصب کی حد تک نہیں رکھا بلکہ اسے اپنی زندگی کا مشن سمجھا۔ان کی زندگی میں ادارے سے وفاداری، علم سے محبت، طلبہ کی تربیت اور عربی زبان وادب کی خدمت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

ان کے انتقال کے ساتھ ندوۃ العلماء ایک ایسے بزرگ عالم، مدرس، ادیب اور منتظم سے محروم ہو گیا جس نے اس ادارے کی علمی روایت کو اپنی آنکھوں کے سامنے کئی دہائیوں تک آگے بڑھتے دیکھا۔ ان کے شاگرد آج ہندوستان اور بیرونِ ملک مختلف علمی، دینی اور تعلیمی میدانوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ استاذ کی حقیقی میراث یہی ہوتی ہے کہ اس کے جانے کے بعد بھی اس کے فیض یافتہ لوگ علم کی شمع کو آگے لے کر چلتے رہیں۔

مولانا سعید الرحمن اعظمی ندویؒ کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ ایک عالم کی اصل عظمت صرف اس کے منصب میں نہیں بلکہ اس علم میں ہے جو وہ دوسروں تک پہنچاتا ہے، ان شاگردوں میں ہے جن کی تربیت کرتا ہے، ان کتابوں میں ہے جو پیچھے چھوڑتا ہے، اور اس علمی ماحول میں ہے جسے وہ اپنے وجود سے مضبوط کرتا ہے۔ انہوں نے تقریباً سات دہائیوں پر مشتمل علمی زندگی میں اسی حقیقت کو اپنے عمل سے ثابت کیا۔

آج ان کے انتقال پر ان کے شاگرد، رفقاء، اہلِ علم، ندوۃ العلماء سے وابستہ افراد اور عربی زبان وادب سے تعلق رکھنے والے بے شمار لوگ غم زدہ ہیں۔ مگر اہلِ علم کی زندگی کا خاتمہ ان کی وفات کے ساتھ نہیں ہوتا۔ ان کے افکار، کتابیں، مقالات، شاگرد اور علمی خدمات آنے والی نسلوں تک ان کا تعارف کراتی رہیں گی۔

حضرت مولانا سعید الرحمن اعظمی ندویؒ کا انتقال یقیناً ایک بڑا علمی خسارہ ہے۔ انہوں نے ایک ایسے زمانے میں زندگی گزاری جس میں ہندوستان کے دینی مدارس، عربی زبان وادب اور عالمِ اسلام کے درمیان علمی رابطے کو مضبوط کرنے کی ضرورت تھی، اور انہوں نے اس ضرورت کو محسوس بھی کیا اور اپنی بساط بھر اس کی تکمیل بھی کی۔ ان کی زندگی علم، قلم، تدریس، دعوت اور ادارہ جاتی خدمت کے ایک طویل سفر کی داستان ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا سعید الرحمن اعظمی ندویؒ کی کامل مغفرت فرمائے، ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، ان کی علمی و دینی خدمات کو شرفِ قبول بخشے، ان کے شاگردوں اور متعلقین کو ان کے مشن کو آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے اور دار العلوم ندوۃ العلماء کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے، ان کے لیے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور تمام اہلِ خانہ، تلامذہ، متعلقین اور محبین کو صبرِ جمیل نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

انحراف کیا ہے؟

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب
ملخص : مفتی شاد محمد شاد

۲۷ ستمبر ۲۰۲۶ء کو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں منعقد کانفرنس بعنوان ''أثر الفتوى في مواجهة الانحرافات الفكرية'' میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے ایک مختصر محاضرہ پیش کیا تھا۔ اسی محاضرہ کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

انحراف جادۂ حق سے ہٹ جانے، یعنی صراطِ مستقیم سے عدول کرنے کا نام ہے۔ انسان جب بھی صراطِ مستقیم سے دائیں یا بائیں مڑ جائے، وہ منحرف ہے۔ اور صراطِ مستقیم وہ ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے کلامِ مجید میں یا اپنے نبی کریم ﷺ کی سنت میں بیان فرما دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الشوریٰ میں رسول اللہ ﷺ کے حق میں گواہی دی: ﴿وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾ (اور بلاشبہ آپ سیدھے راستے کی طرف رہنمائی فرماتے ہیں)۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے خبر دی کہ اس شاہراہ سے بہت سے انحرافات پیدا ہوں گے، لیکن ساتھ ہی قیامت تک کے لیے ہم سب کو یہ رہنمائی بھی دے دی کہ صراطِ مستقیم وہی ہے جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔ چنانچہ صراطِ مستقیم قرآنِ کریم اور سنتِ نبویہ ہے، اسی فہم کے مطابق جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور سلفِ صالحین نے سمجھا۔ جو شخص اس طریقے سے ہٹے، وہ منحرف ہے۔

انحرافات کا پس منظر: یہ انحرافات صحابہ کے زمانے سے شروع ہو گئے تھے۔ خوارج آئے، پھر معتزلہ، جہمیہ، کرامیہ جیسے فرقے پیدا ہوئے، جو برسوں عوام پر اثر انداز رہے۔ لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ﴾ (جھاگ تو سوکھ کر ضائع ہو جاتا ہے، اور جو چیز لوگوں کو نفع دیتی ہے وہ زمین میں ٹھہری رہتی ہے)۔ چنانچہ یہ سارے منحرف نظریات آخر کار مٹ گئے اور اب کتابوں اور تاریخ کے صفحات کے سوا کہیں نہیں ملتے۔ اسی طرح موجودہ دور کے انحرافات بھی، خواہ کتنے ہی عام اور پھیلے ہوئے ہوں، ان شاء اللہ مسلمانوں اور علماء کی کوششوں سے ختم ہو جائیں گے۔

انحراف کی جڑ اور دو قسمیں: ان سب انحرافات کی جڑ نصوص کی غلط تاویل ہے۔ آج کے دور میں یہ دو صورتوں میں سامنے آتا ہے: پہلی قسم: غلو: صحیح اور گہرے علم کے بغیر نصوص کی تعبیر کرنا، جس نے بہت سے لوگوں کو انتہا پسندی تک پہنچایا۔ وہ مسلمانوں کی تکفیر، تبدیع اور تضلیل کرنے لگے۔ خصوصاً مسلم ممالک کے حکمرانوں کو گمراہ اور مرتد قرار دے کر یہ فتویٰ دینے لگے کہ عام لوگوں پر ان کے خلاف ہتھیار اٹھانا واجب ہے، اور اسے جہاد کا نام دے دیا۔ حضرت کے بقول اسے نہ قرآن قبول کرتا ہے نہ سنت۔ یہ نصوص کو غلط طریقے سے پڑھنے کا نتیجہ ہے، اور اسی کی طرف نبی ﷺ نے غلو کرنے والوں کی تحریف اور جاہلوں کی تاویل کہہ کر اشارہ فرمایا۔

دوسری قسم: نصوص سے انحلال: یعنی نصوص کی پابندی سے آزادی اختیار کرنا۔ ایک طبقہ ایسا ہے جس نے اپنے آپ کو مغربی نظریات کے حوالے کر دیا، اور یہ اعتقاد بنالیا کہ حق سارا کا سارا وہی ہے جو اہلِ مغرب فلسفے اور علوم میں مانتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ نصوص کی گردنیں مروڑ کر انہیں اپنی ان خواہشات کے مطابق ڈھال لیں جو مغربی نظریات پر قائم ہیں۔ یہ بھی اسی فکری انحراف کا حصہ ہے جس میں ہم اپنے دور میں مبتلا ہیں۔ کچھ لوگ اسی بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ سارا کا سارا حق مغرب ہی کے نظریات، فلسفے، آراء اور افکار میں ہے، اور وہ نصوص کی گردنیں اپنی خواہشات اور آراء کے مطابق موڑنا چاہتے ہیں۔ آج کے دور کے فکری انحرافات کی یہی دو قسمیں ہیں: ایک طرف غلو، دوسری طرف نصوص سے بے قیدی۔

علماء کی ذمہ داری اور کردار: حضرت نے فرمایا: دنیا بھر کے علماء پر لازم تھا کہ وہ قطعی دلائل کے ساتھ ان دونوں انحرافات کا مقابلہ کرتے، ایسے دلائل سے جو عوام اور خصوصاً نوجوانوں کو مطمئن کر دیں۔ اس میں مملکتِ سعودی عرب کا بڑا کردار ہے، اور یہ اس کی حیثیت کے مطابق ہی تھا، کیونکہ وہ حرمین شریفین اور جزیرۃ العرب کی محافظ ہے۔ اس نے فکری اور عملی دونوں سطح پر سنجیدہ اقدامات کیے۔ اس سلسلے میں انہوں نے خاص طور پر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا ذکر کیا، جس نے قرآن وسنت کے علوم سلفِ صالحین کے منہج پر پڑھائے، اور مشرق ومغرب میں پھیلی ہوئی مسلمانوں کی ایک ایسی نسل تیار کی جو غلو اور بے قیدی دونوں سے دور ہے اور صحیح منہج پر قائم ہے۔ اس پر انہوں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

فتوی کا کردار: پھر حضرت نے فتویٰ کے کردار کی بات کی، کیونکہ منحرف افکار کے مقابلے میں فتویٰ کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ انہوں نے اس موقعہ پر سعودی عرب کے بہت سے ان اداروں کا نام لیا جسے سعودی عرب کی سرپرستی حاصل ہے۔ ان اداروں نے افتاء، گہری علمی تحقیق اور افراط وتفریط کے درمیان اعتدال کے ذریعے عصری مسائل حل کیے، اور ایسے ٹھوس فتاویٰ جاری کیے جو پورے عالمِ اسلام میں پھیلے اور ہر قسم کی انتہا پسندی، چاہے غلو کی ہو یا نصوص سے بے قیدی کی، کا مؤثر جواب بنے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ دوسرے ممالک میں بھی ایسے علماء موجود ہیں جنہوں نے ان باطل افکار کا مقابلہ کیا، کتابیں لکھیں، خطبات دیے اور صراطِ مستقیم کی دعوت دی، اور امت ان شاء اللہ راسخ العلم اور معتدل علماء سے کبھی خالی نہیں ہوگی۔ لیکن چونکہ اسلام کا سرچشمہ مکہ اور مدینہ ہیں، اس لیے ذمہ داری اس سرزمین پر دوسروں کی نسبت زیادہ ہے۔

سوال: مذاہب کے بارے میں جمود اور تعصب: نظامت کرنے والے نے درخواست کی کہ آخر میں ایک اور بات مختصراً بیان فرمادیں کہ بعض اوقات فقہی مذاہب کے بارے میں جمود اور تعصب بھی فکری انحراف کو ہوا دیتا ہے۔

جواب: حضرت نے فرمایا کہ: تمام فقہی مذاہب معتبر ہیں۔ صحابہ کے درمیان بھی اختلاف رہا، مگر کسی صحابی سے یہ منقول نہیں کہ اس نے کسی مختلف رائے رکھنے والے کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کیا ہو۔ یہ مذاہب فقہی مذاہب ہیں، الگ دین نہیں۔ اس لیے سب مذاہب اور ان کے پیروکاروں کا احترام کرنا چاہیے، ان کے درمیان اتحاد کی فضا قائم رکھنی چاہیے، اور فقہی اختلافات کو مسلمانوں کے درمیان تفرقے اور دوری کا سبب نہیں بننے دینا چاہیے۔ منحرف افکار کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے۔

آزمائش ایمان کی کسوٹی

مولانا محمد ناصر ندوی پرتاپ گڑھی

انسان کی اصل پہچان صرف یہ نہیں کہ وہ خوش حالی کے زمانے میں اللہ کو یاد کرتا ہے، مسجد کا رخ کرتا ہے، عبادت میں دل لگاتا ہے اور زبان سے شکر کے کلمات ادا کرتا ہے، اصل امتحان اس وقت ہوتا ہے جب حالات اس کی خواہش کے مطابق نہ رہیں، مشکلات اس کے راستے میں حائل ہوں، دعائیں بظاہر قبول ہوتی ہوئی محسوس نہ ہوں، کاروبار میں نقصان ہوجائے، بیماری آجائے، عزت ومقام میں کمی آئے یا زندگی کسی ایسے موڑ پر پہنچ جائے جہاں صبر، یقین اور توکل کا تقاضہ ہو۔ ایسے مواقع پر معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا اللہ سے تعلق کتنا گہرا ہے اور اس کا ایمان حالات کا تابع ہے یا اللہ کی ذات پر مضبوط یقین کے ساتھ قائم ہے۔

بعض لوگ اللہ تعالیٰ سے تعلق بھی اپنے مفاد کے پیمانے سے قائم کرتے ہیں۔ حالات اچھے ہوں تو عبادت میں ذوق، زبان پر شکر اور دل میں اطمینان، لیکن جیسے ہی کوئی آزمائش آتی ہے، شکایت شروع ہوجاتی ہے، عبادت میں سستی پیدا ہوجاتی ہے اور کبھی انسان کے دل میں ایسے خیالات آنے لگتے ہیں جو اس کے ایمان کو کمزور کردیتے ہیں۔ گویا اللہ سے تعلق اس وقت تک قائم ہے جب تک زندگی اس کی مرضی کے مطابق چل رہی ہے۔ قرآن کریم ایسے رویے کو یوں بیان کرتا ہے:

”وَمِنَ النَّاسِ مَن يَعْبُدُ اللَّهَ عَلَىٰ حَرْفٍ فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ ۖ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انقَلَبَ عَلَىٰ وَجْهِهِ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ“ (الحج:۱۱)۔

ترجمہ: ”اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو اللہ کی عبادت ایک کنارے پر رہ کر کرتا ہے، پھر اگر اسے کوئی بھلائی پہنچ جائے تو اس سے مطمئن ہوجاتا ہے، اور اگر اسے کوئی آزمائش پیش آجائے تو منہ کے بل پھر جاتا ہے۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں کا نقصان اٹھاتا ہے، یہی کھلا ہوا نقصان ہے۔“

یہ آیت ایمان کی حقیقت بیان کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق کسی وقتی فائدے، دنیاوی کامیابی یا حالات کی سازگاری پر قائم نہیں ہونا چاہئے۔ مومن اللہ کی عبادت اس لئے نہیں کرتا کہ اسے ہر حال میں دنیا کی آسائشیں ملتی رہیں گی، بلکہ اس لئے کہ اس نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے معاہدہ کررکھا ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے، اللہ اس کا رب ہے، وہ اس کا خالق ہے، اسی کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے، اسی کے اختیار میں نفع ونقصان ہے اور بالآخر اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

زندگی آزمائشوں کی آماجگاہ ہے۔ کبھی انسان صحت سے آزمایا جاتا ہے اور کبھی بیماری سے، کبھی دولت سے اور کبھی تنگ دستی سے، کبھی کامیابی سے اور کبھی ناکامی سے، کبھی لوگوں کی محبت سے اور کبھی ان کی بے اعتنائی سے۔ کبھی انسان کو وہ مل

جاتا ہے جس کی اسے خواہش ہوتی ہے اور کبھی وہ چیز نہیں ملتی جس کے لئے اس نے بہت کوشش کی ہوتی ہے۔لیکن مومن کا کمال یہ ہے کہ حالات بدلتے رہیں، اس کا رب نہیں بدلتا، راستے دشوار ہوجائیں، اس کا یقین کمزور نہیں ہوتا، دنیا ساتھ چھوڑ دے، وہ اللہ کا دامن نہیں چھوڑتا۔

ہمیں اپنے ایمان کا جائزہ بھی اسی زاویے سے لینا چاہئے۔اگر ہماری نماز صرف اس وقت اچھی ہے جب زندگی میں سکون ہے، اگر تلاوت صرف فراغت کے دنوں کا معمول ہے، اگر دعا صرف ضرورت کے وقت یاد آتی ہے، اگر مسجد سے تعلق صرف کسی خاص پریشانی کے وقت بڑھ جاتا ہے اور مشکل دور ہوتے ہی عبادت بھی کم ہوجاتی ہے تو ہمیں اپنے دل سے سوال کرنا چاہئے کہ ہمارا تعلق اللہ کے ساتھ کتنا مضبوط ہے، بعض اوقات انسان اللہ کو صرف اپنی ضرورتوں کا وسیلہ سمجھنے لگتا ہے۔ بیماری آئی تو دعا، کاروبار میں مشکل آئی تو دعا، اولاد کا مسئلہ آیا تو دعا، امتحان کا وقت آیا تو دعا، سفر کا موقع آیا تو دعا، لیکن جب ضرورت پوری ہوجاتی ہے تو وہی انسان اپنے رب کو بھول جاتا ہے۔ یہ رویہ بندگی کی روح کے خلاف ہے۔ بندگی کا مطلب یہ ہے کہ انسان خوشی میں بھی اللہ کا بندہ ہو اور غم میں بھی، کامیابی میں بھی اس کے سامنے جھکے اور ناکامی میں بھی اسی سے رجوع کرے، صحت میں بھی اسے یاد کرے اور بیماری میں بھی، فراخی میں بھی شکر کرے اور تنگی میں بھی صبر کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کی اسی کیفیت کو بیان فرمایا:

"عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ لَهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذَاكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ" (مسلم: 2999).

ترجمہ: ''مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے، اس کا ہر معاملہ اس کے لئے خیر ہی خیر ہے، اور یہ بات مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اگر اسے خوش حالی پہنچتی ہے تو شکر کرتا ہے، یہ اس کے لئے بہتر ہے، اور اگر اسے تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے، یہ بھی اس کے لئے بہتر ہے۔''

یہی وہ موقع ہے جب مومن اور عام انسان کے درمیان نمایاں فرق پیدا ہوتا ہے۔ عام انسان حالات سے متاثر ہوکر اپنے رویے بدلتا ہے، لیکن مومن حالات کو اللہ کی طرف سے آنے والی آزمائش سمجھ کر اپنے ایمان، صبر اور عمل کو سنبھالتا ہے۔ اس کے لئے خوشی بھی امتحان ہے اور غم بھی امتحان۔ دولت ملنا بھی امتحان ہے اور غربت بھی، منصب ملنا بھی امتحان اور محرومی بھی امتحان ہے۔ ہماری زندگی میں ایسے بہت سے مواقع آتے ہیں جب اللہ تعالیٰ ہماری خواہش کے خلاف فیصلہ فرماتا ہے۔ انسان کسی چیز کو اپنے لئے بہتر سمجھتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اسے اس سے محروم کردیتا ہے۔ کبھی انسان کسی راستے پر پوری قوت سے چلنا چاہتا ہے، لیکن حالات اس کا راستہ روک دیتے ہیں۔ ایسے وقت میں مومن کا کام یہ نہیں کہ وہ اپنے رب کے فیصلے پر شکوہ کرے، بلکہ اسے یہ یقین رکھنا چاہئے کہ جس ذات نے اسے پیدا کیا ہے، وہ اس سے زیادہ جانتی ہے کہ اس کے لئے کیا بہتر ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا:

"وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ، وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ" (البقرۃ:216)۔

ترجمہ: "ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو، اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لئے بری ہو، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

یہ یقین مسلمان کو اندر سے مضبوط بناتا ہے۔ وہ ہر واقعے کو اپنی خواہش کے ترازو میں نہیں تولتا بلکہ اللہ کی حکمت پر اعتماد کرتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا دارالامتحان ہے، دارالجزاء نہیں۔ یہاں ہر خواہش پوری ہونا ضروری نہیں، ہر دعا اسی صورت میں قبول ہونا ضروری نہیں جس صورت میں ہم چاہتے ہیں، اور ہر راستہ آسان ہونا بھی ضروری نہیں۔

سیرتِ نبوی ﷺ میں ہمیں ثابت قدمی کے بے شمار نمونے ملتے ہیں۔ مکہ مکرمہ میں آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے شدید مخالفت، ظلم، سماجی بائیکاٹ اور طرح طرح کی تکالیف برداشت کیں، لیکن دین کے راستے سے پیچھے نہیں ہٹے۔ طائف میں آپ ﷺ کو جو تکلیف پہنچی، وہ بھی تاریخ کا ایک عظیم واقعہ ہے۔ لوگوں نے پتھر مارے، جسم مبارک لہولہان ہوا، لیکن آپ ﷺ نے اپنی دعوت اور اپنے رب سے تعلق کو نہیں چھوڑا۔ مدینہ منورہ میں بھی حالات ہمیشہ آسان نہیں رہے۔ بدر، احد، خندق اور دوسرے مواقع پر مسلمانوں کو سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ کبھی فتح ملی اور کبھی وقتی نقصان کا سامنا کرنا پڑا، مگر ایمان کی بنیاد نہیں ہلی۔ یہی وہ کردار ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ مومن کا تعلق حالات سے نہیں بلکہ اللہ سے ہوتا ہے۔

آج ہماری ایک بڑی کمزوری یہ بھی ہے کہ ہم فوری نتائج کے عادی ہو گئے ہیں۔ دعا کی اور فوراً نتیجہ چاہتے ہیں، محنت کی اور فوراً کامیابی چاہتے ہیں، نیکی کی اور فوراً دنیاوی فائدہ چاہتے ہیں۔ جب ایسا نہیں ہوتا تو بعض لوگ مایوس ہو جاتے ہیں۔ ہمیں سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کا نظام ہماری خواہشات کے مطابق نہیں چلتا۔ بعض دعائیں دنیا میں اسی شکل میں قبول ہوتی ہیں جس کی ہم خواہش کرتے ہیں، بعض کا اثر کسی دوسری صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور بعض کا اجر آخرت کے لئے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے مومن کو دعا کرتے ہوئے بھی اللہ پر اعتماد رکھنا چاہئے اور انتظار کرتے ہوئے بھی اس کے فیصلے پر راضی رہنا چاہئے۔ عبادت کا مقصد صرف مسئلہ حل کروانا نہیں، بلکہ بندے کا اپنے رب سے تعلق مضبوط رکھنا ہے۔

ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ کہیں ہماری دینداری مخصوص ماحول کی پابند تو نہیں، مسجد میں ایک کیفیت، گھر میں دوسری، رمضان میں ایک رنگ، رمضان کے بعد دوسرا، خوش حالی میں ایک انداز، پریشانی میں دوسرا۔ اگر عبادت کا ذوق صرف مخصوص موسموں اور حالات تک محدود ہے تو ہمیں اپنے ایمان کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ رمضان ہمیں تقویٰ سکھاتا ہے، لیکن رمضان کے بعد بھی تقویٰ باقی رہنا چاہئے۔ حج انسان کو اللہ کے سامنے جھکنا سکھاتا ہے، لیکن حج سے واپسی کے بعد بھی وہی عاجزی باقی رہنی چاہئے۔ مسجد ہمیں اللہ سے جوڑتی ہے، لیکن بازار، دفتر، گھر اور معاشرہ بھی ہماری بندگی کے امتحان کی جگہیں ہیں۔ اصل کامیابی یہ ہے کہ انسان تنہائی میں بھی اللہ کو یاد کرے، مجمع میں بھی، آسانی میں بھی نیکی کرے،

مشکل میں بھی، تعریف ملے تو عاجزی اختیار کرے اور تنقید ہو تو صبر کرے، کامیابی ملے تو شکر کرے اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑے تو سبق لے۔ اس کی زبان حالات کے بدلنے سے ایمان کے الفاظ نہ بدلے اور اس کا دل دنیا کے اتار چڑھاؤ سے اپنے رب کے بارے میں بدگمان نہ ہو۔

خصوصاً نوجوانوں کو اس حقیقت کو خوب اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ زندگی کے ابتدائی مراحل میں ناکامی، بے روزگاری، امتحان میں ناکامی، رشتوں کے مسائل، مالی پریشانی اور مستقبل کی بے یقینی انسان کو اندر سے توڑ سکتی ہے۔ ایسے وقت میں ایمان کا سہارا سب سے بڑی قوت بن سکتا ہے۔ ناکامی یہ نہیں کہ ایک دروازہ بند ہو گیا، ناکامی یہ ہے کہ انسان اللہ سے اپنا تعلق کمزور کر لے۔ ایک امتحان میں ناکامی پوری زندگی کی ناکامی نہیں، ایک کاروبار کا نقصان رزق کے دروازے بند نہیں کرتا اور کسی مقصد میں تاخیر اللہ کی رحمت سے محرومی کی دلیل نہیں۔ اسی طرح خوش حالی بھی ایک امتحان ہے۔ دولت، شہرت، منصب اور کامیابی ملنے کے بعد انسان اگر اپنے رب کو بھول جائے تو یہ کامیابی اس کے لئے خطرہ بن سکتی ہے۔ زندگی میں ہمیں بار بار اپنے دل سے یہ سوال کرنا چاہئے کہ اگر میری خواہش پوری نہ ہو تو کیا میں اللہ سے جڑا رہوں گا، اگر میری دعا میں تاخیر ہو جائے تو کیا میرا یقین باقی رہے گا، اگر لوگ میرا ساتھ چھوڑ دیں تو کیا میں اللہ کا دامن تھامے رکھوں گا، اگر مجھے کامیابی کے بجائے ناکامی ملے تو کیا میں عبادت چھوڑ دوں گا؟ ان سوالات کے جوابات ہمارے ایمان کی کیفیت واضح کر سکتے ہیں۔

حقیقی ایمان وہ ہے جو انسان کو حالات کا غلام نہیں بننے دیتا۔ مومن حالات کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن حالات بدلنے تک اپنے رب سے تعلق نہیں توڑتا۔ وہ دعا بھی کرتا ہے، تدبیر بھی اختیار کرتا ہے، محنت بھی کرتا ہے اور نتیجہ اللہ کے سپرد بھی کرتا ہے۔ وہ آزمائش سے ٹوٹتا نہیں اور نعمت سے غافل نہیں ہوتا۔ ہمیں اپنی زندگی میں ایک ایسا ایمان پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو صرف زبان کا اقرار نہ ہو بلکہ کردار کی قوت بن جائے، جو گھر میں بھی نظر آئے اور بازار میں بھی جو خوشی میں بھی زندہ رہے اور غم میں بھی، جو تنہائی میں بھی انسان کو گناہ سے روکے اور مجمع میں بھی حق بات کہنے کا حوصلہ دے سکے۔ ہمیں اپنے دل میں یہ عہد کرنا چاہئے کہ ہمارا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی موسم، کسی ضرورت، کسی فائدے یا کسی وقتی کیفیت کا محتاج نہیں ہوگا۔ ہم آسانی میں بھی اس کے بندے رہیں گے اور مشکل میں بھی، خوشی میں بھی اسے یاد کریں گے اور غم میں بھی، کامیابی میں بھی اسی کے سامنے جھکیں گے اور ناکامی میں بھی اسی سے مدد مانگیں گے۔ یہی ایمان کی پختگی ہے اور یہی بندگی کی حقیقت ہے۔

آیئے ہم اپنے ایمان کو اس مقام تک لے جانے کی کوشش کریں جہاں حالات ہمارے دل کا رخ متعین نہ کر سکیں بلکہ ہمارا یقین حالات کا سامنا کرنے کی قوت بن جائے۔ ہم نعمت میں شکر گزار، آزمائش میں صابر، کامیابی میں متواضع اور ناکامی میں ثابت قدم رہیں۔ ہمارا رب ہمیں آسانیاں دے تو ہم اس کے شکر گزار بندے بنیں، وہ ہمیں آزمائے تو ہم صبر کے ساتھ اس کی طرف مزید بڑھیں۔ دنیا ہمیں جو کچھ دے یا نہ دے، ہمارے پاس سب سے بڑی دولت اللہ سے مضبوط تعلق ہو۔ یہی وہ دولت ہے جو انسان کو دنیا میں سکون اور آخرت میں اللہ خوشنودی عطا کرتی ہے۔

کاف ونون کے درمیان!

مولانا عبید انور شاہ

زندگی کیا ہے اور حاصلِ زندگی کیا.....؟ یہ کوئی فلسفیانہ سوال ہے، نہ کسی حقیقت کی تلاش ہے.....؛ یہ تو ایک دائمی الجھن اور مسلسل اضطراب ہے..... ''کَانَ اللّٰہُ وَلَمْ یَکُنْ مَعَہٗ شَیْءٌ'' سے بات شروع ہوئی، اور نہ جانے کب، کیوں، ''کُنْ فَیَکُوْنُ'' تک جا پہنچی.....؛ پھر آخر میں ''کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ، وَیَبْقَی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِکْرَامِ'' پر آٹھہرے گی.....

یہی کل حقیقت ہے..... اس حقیقت کی پرتوں میں بے شمار انسانوں کی لاتعداد زندگیوں کے لامحدود قصے، لامتناہی داستانیں موجود ہیں..... ان بے شمار انسانوں میں سے ہر فرد کی بے شمار خواہشیں.....، بے پناہ تمنائیں.....، نہ ختم ہونے والی آرزوئیں.....، غم وخوشی کے ہزار ہا رنگ.....، مسرت واذیت کے بے حد وحساب آہنگ.....، ایک ادنیٰ انسان اور حدود سے ماوراء اس کے تخیلات کا وسیع ترین آسمان.....!

اس ازلی حقیقت اور ابدی انجام کے درمیان جو کچھ ہے..... یہ انسان، اس کی مختصر سی عمر.....، اس کی ان گنت خواہشات.....، اس کے خواب.....، اس کے دکھ.....، اس کی خوشیاں.....، اور اس کا وہ ناپیدا کنار تخیل جو جسم کی تنگ قید سے نکل کر آسمانوں کی وسعتوں کو چھونا چاہتا ہے..... یہ سب اسی ''کُن'' کے، ''ک'' اور ''ن'' کے درمیان کی داستانیں ہیں.....

مگر اس وسیع ترین آسمان کے نیچے انسان کی زندگی کتنی مختصر.....، کتنی محدود اور کتنی عجیب ہے.....! وہ آتا ہے تو اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا.....، مگر دیکھتے ہی دیکھتے خواہشوں کا ایک پورا جہان اس کے اندر آباد ہو جاتا ہے..... پھر وہ اپنی پوری زندگی اسی جہان کو آباد رکھنے.....، پھیلانے..... اور اس کی کمی پوری کرنے میں لگا دیتا ہے..... ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو دوسری جنم لیتی ہے.....، ایک منزل ملتی ہے.....، تو دوسری سامنے آ کھڑی ہوتی ہے.....، ایک خواب تعبیر پاتا ہے تو کئی نئے خواب آنکھوں میں اتر آتے ہیں..... یوں زندگی حصول سے زیادہ تعاقب بن جاتی ہے.....؛ انسان منزل سے زیادہ راستے میں رہتا ہے.....، اور شاید اسے خبر بھی نہیں ہوتی کہ جس چیز کو وہ زندگی سمجھ کر دوڑ رہا ہے، وہی اس کی زندگی کو مسلسل اس سے دور بھی کیے جا رہی ہے.....

وہ سمجھتا ہے کہ خوشی کسی آنے والے دن میں ہے.....، کسی اگلی منزل میں.....، کسی مطلوب شے کے حصول

میں.....، کسی شخص کے مل جانے میں یا کسی محرومی کے ختم ہو جانے میں.....، مگر جب وہ دن آتا ہے تو اس کے ساتھ ایک نیا ''کل'' پیدا ہو چکا ہوتا ہے..... خواہش کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا؛ انسان بدلتا رہتا ہے، اس کی چیزیں بدلتی رہتی ہیں، اس کے خواب بدلتے رہتے ہیں، مگر خواہش باقی رہتی ہے..... شاید یہی انسانی زندگی کا سب سے عجیب المیہ ہے کہ انسان جس سکون کی تلاش میں تمام عمر بے قرار رہتا ہے، اس کی تلاش ہی اس کے اضطراب کا حصہ بن جاتی ہے.....۔

بچپن میں اسے کھلونوں کی طلب ہوتی ہے.....، پھر کتابوں کی.....، کامیابی کی.....، پہچان کی.....، محبت کی.....، دولت کی.....، عزت کی اور اختیار کی..... عمر بدلتی ہے، تو خواہشوں کے نام بدل جاتے..... ہیں، مگر خواہش کا مزاج نہیں بدلتا..... جس چیز کے نہ ملنے پر بچپن میں آنکھ نم ہوتی تھی، جوانی میں اس کی جگہ کوئی اور محرومی لے لیتی ہے..... پھر انسان ایک دن پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی ایک بڑی مدت ان چیزوں کے حصول میں گزر گئی، جنہیں حاصل کرنے کے بعد بھی دل وہیں کا وہیں رہا.....۔

اور پورے کھیل کا سب سے خاموش کردار ہے..... ''وقت''۔ نہ وہ کسی خواہش کے پورا ہونے پر رکتا ہے، نہ کسی محرومی پر ٹھہرتا ہے..... انسان سمجھتا ہے کہ ابھی بہت وقت ہے، مگر وقت کبھی ''بہت'' نہیں ہوتا؛ وہ صرف گزر رہا ہوتا ہے..... کل، آج بنتا ہے اور آج، گزرے ہوئے کل میں تبدیل ہو جاتا ہے..... سال تاریخوں میں بدلتے ہیں، تاریخیں یادوں میں، اور یادیں آہستہ آہستہ ایک ایسی زندگی کی کسک بن جاتی ہیں جو کبھی ہم نے جی تھی، مگر اب وہ بھی دسترس سے باہر تھی.....۔

جوانی اپنے ساتھ طاقت، خواب اور امکانات لاتی ہے۔ انسان کو لگتا ہے کہ دنیا ابھی اس کے سامنے کھلی ہوئی ہے؛ جو چاہے گا حاصل کر لے گا، جہاں چاہے گا پہنچ جائے گا، جس طرح چاہے گا زندگی کو ڈھال لے گا..... مگر اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اسی دوران زندگی اسے اپنی شکل میں ڈھال رہی ہے، اپنے سانچے میں اتار رہی ہے..... طاقت کم ہوتی ہے، خواہشیں کچھ اور ہو جاتی ہیں، خوابوں کی تعداد گھٹتی نہیں مگر ان کی نوعیت بدل جاتی ہے، اور ایک وقت آتا ہے جب انسان مستقبل بنانے سے زیادہ ماضی کو یاد کرنے لگتا ہے.....۔

پھر وہی انسان.....، جو کبھی آسمانوں کو چھونے کے خواب دیکھتا تھا، اپنے ''جسم کی حدود'' سے واقف ہونے لگتا ہے..... جو قدم کبھی منزلوں کی طرف اٹھتے تھے، وہ اب تھکنے لگتے ہیں..... جو آنکھیں آنے والے دنوں کے خواب دیکھا کرتی تھیں، وہ گزرے ہوئے دنوں کی تصویریں ڈھونڈنے لگتی ہیں اور جس زندگی کو وہ ہمیشہ اپنے اختیار میں سمجھتا رہا، وہ خاموشی سے اس کے اختیار سے نکل چکی ہوتی ہے..... تب شاید پہلی بار سوال اپنی اصل صورت میں سامنے آتا ہے: میں نے کیا چاہا تھا، کیا حاصل کیا، اور آخر کیا باقی رہ گیا.....؟

مال تھا، تو خرچ ہو گیا.....؛ جوانی تھی، تو گزر گئی.....؛ حسن تھا، تو ڈھل گیا.....؛ شہرت تھی، تو کسی اور نام کے شور میں

دب گئی.....؛ عہدہ تھا، تو کسی اور کے ہاتھ آ گیا.....؛ تعلقات تھے، تو کچھ ساتھ رہے، کچھ راستے میں چھوٹ گئے.....۔ خواب تھے کچھ پورے ہوئے، کچھ ادھورے رہ گئے، اور کچھ ایسے تھے جن کے پورا ہونے کا انتظار ہی زندگی کے خاتمے تک جاری رہا.....۔

تو کیا زندگی کا حاصل صرف یہی ہے.....؟

خواہش کرنا.....، اس کے پیچھے بھاگنا.....، اسے حاصل کرنا.....، چند لمحے خوش ہونا.....، پھر کسی نئی خواہش میں مبتلا ہو جانا.....، اور آخر کار ان تمام خواہشوں، کامیابیوں اور ناکامیوں کو پیچھے چھوڑ کر چلے جانا.....؟

شاید یہاں آ کر ''حاصلِ زندگی'' کا سوال اپنی پہلی صورت سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے.....۔ اب سوال یہ نہیں رہتا کہ انسان نے زندگی میں کتنا حاصل کیا.....؛ سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جس زندگی کو حاصل کرنے میں وہ تمام عمر لگا رہا، وہ خود اس کے ہاتھ میں کتنی دیر رہی.....؟ اور شاید اس سے بھی بڑا سوال یہ ہے کہ جب زندگی ہی باقی نہیں رہنی ہے، تو پھر اس فانی زندگی میں جو کچھ حاصل کیا گیا، اس میں سے کیا باقی رہ جائے گا؟..... کچھ بھی تو نہیں۔

مال، مکان، عہدہ، شہرت، حسن، جوانی، خواہشیں، خواب سب وقت کی ایک ہی بے رحم گردش میں آتے اور چلے جاتے ہیں.....۔ انسان جسے اپنی زندگی سمجھتا ہے، وہ بھی آخر کار اس سے چھین لی جاتی ہے.....، اور جسے اپنا حاصل سمجھتا ہے، وہ بھی کسی نہ کسی دن اس کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے.....۔ پھر کیا باقی رہتا ہے.....؟

صرف وہی جو ابتدا سے تھا اور انتہا میں بھی رہے گا.....۔

''كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ، وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ''

اور اسی ایک حقیقت کے پرتو میں کہیں نہ کہیں، زندگی کیا ہے.....، اس سوال کا جواب بھی ہے.....، اور حاصلِ زندگی کیا، اس کا بیان بھی.....۔

اسلام کا اخلاقی پہلو

عمر فاروق ندوی فتحپوری

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اخلاق حمیدہ کا انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی میں اپنے ہم جولیوں اور ہم عصروں کے مابین شان امتیازی حاصل کرنے میں ایک اہم اور مؤثر کردار ہوتا ہے، ہمارے معاشرے میں عام طور سے لوگ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے مل جاتے ہیں کہ جس کے اخلاق اچھے ہوتے ہیں اس کی شان نرالی ہوتی ہے، مگر تعجب خیز بات یہ ہے کہ بہت کم لوگوں کو یہ علم ہوتا ہے کہ اخلاق کا صحیح مفہوم اور حقیقی معنی کیا ہے؟ مکارم اخلاق کیا ہیں؟ نبی اکرم مجسم اخلاق محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی زندگی کیا ہے؟ یہ وہ تمام سوالات ہیں جن کے جواب عام طور پر لفظ اخلاق کی ضرب لگانے والوں کے یہاں نہیں ملتے، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ہمارے یہاں ہر ایسے شخص پر لفظ اخلاق کا اطلاق روا سمجھا جاتا ہے جس میں ہم خیر کا کوئی پہلو دیکھتے ہیں۔ چنانچہ لفظ کی حقیقت اور اس کے متعلقات معنی سے صرف نظر ہم ایسے اوصاف اور محاسن کی بنا پر کسی شخص کو بھی صاحب اخلاق فاضلہ کے لقب سے نواز دیتے ہیں، جس پر لفظ اخلاق کا اطلاق سرے سے ہوتا ہی نہیں، اسی لیے اخلاق عالی اور فاضلہ سے متصف ہونے کے لیے سب سے پہلے لفظ اخلاق کی حقیقت جاننا ضروری ہے۔ عربی زبان کے مشہور ومعروف ادیب سید مصطفی لطفی منفلوطی نے اس کے متعلق جو لکھا ہے وہ بہت جامع ہے اور ہم یہاں اسی کو نقل کرتے ہیں، منفلوطی صاحب لکھتے ہیں: ''کہ اخلاق کسی شخص کا اپنے ضمیر کے سامنے اس ذمہ داری کے احساس کا نام ہے کہ اس سے کیا کرنا چاہیے''۔

تعریف ذکر کرنے کے بعد منفلوطی صاحب اس کی قدر تفصیل بھی بیان کرتے ہیں:

''میں کسی ایسے شخص کو اس وقت تک سخی نہیں کہتا جب تک کہ اس کا مخفی صدقہ اس کے عوامی اور اعلانیہ خیرات کے برابر نہ ہوجائے اور میں کسی راست گو اور صادق انسان کو اس وقت تک راست گو نہیں سمجھتا جب تک کہ اس کا عمل اس کے قول کی طرح صادق اور سچا نہ ہوجائے اور میں کسی رحیم کو اس وقت تک رحیم نہیں گردانتا جب تک کہ اس کا دل اس کی آنکھوں سے پہلے نہ رو پڑے اور کوئی متواضع میرے نزدیک متواضع نہیں جب تک کہ اس کی رائے اپنے نزدیک دوسروں کی رائے سے کمتر نہ ہو، اکثر جن لوگوں کو ہم صاحب اخلاق اور پیکر خلق عظیم سمجھتے ہیں ان میں سے زیادہ تر وہ ہوتے ہیں جو محض لوگوں کی چاپلوسی یا خوف وطمع کی وجہ سے اخلاق کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں ورنہ درحقیقت اخلاق تو وہ آنسو ہے جو رحیم وشفیق شخص کی آنکھ سے بے محابا جاری ہوجاتا ہے جب مصائب وآلام سے بھری دنیا پر اس کی نظر پڑتی ہے، اخلاق وہ اضطراب ہے کہ کوئی سخی شخص جب حاجت مند کو لوٹا دے یا کسی مسکین ضعیف کے ساتھ بدسلوکی کردے تو یہ صفت خلق اسے تڑپا کر رکھ دیتی ہے

الغرض اخلاق نتائج اور ملامتوں کی پرواہ کیے بغیر فرض کی ادائیگی کا نام ہے''۔

شیخ منفلوطی کی بیان کردہ اخلاق کی اس وجدانی اور احساساتی تعریف وتشریح کے بعد آیئے دیکھتے ہیں قرآن و سنت کی روشنی میں اخلاق کی اہمیت وافادیت، دعوت دین کے لیے اس کی ضرورت کیا ہے؟ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی زندگی میں ہمارے لیے کیا نمونہ ہے۔ بلاشبہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم جو دین حنیف لے کر مبعوث ہوئے وہ سراپا اخلاقی تعلیمات اور اعمال صالحہ کی ترغیبات سے بھرا پڑا ہے، خود محمد مصطفی ﷺ ان تمام اخلاقی تعلیمات کا اعلی مجسم نمونہ تھے، جس کا اعتراف قرآن نے خود کیا۔ حضرت عائشہ کا یہ تاریخی جملہ بھی کتابوں کی زینت ہے جب آپ سے رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو آپنے فرمایا: ''کان خلقه القرآن''

قرآن وسنت نے جو اخلاقی تعلیمات بیان فرمائی اور رسول اسلام نے جو اخلاقی نمونہ پیش فرمایا درحقیقت بات یہ ہے کہ دنیا کے کسی ماہر نفسیات، کسی فلسفی، کسی مصلح اور کسی بھی رفارمر نے اخلاق کا وہ مکمل قولی اور عملی نظام پیش نہیں کیا جس کے قول وعمل میں کوئی تضاد نہ ہو، روئے زمین پر پہلی مرتبہ یہ اعلان ہوا: ''إنما بُعثت لأتمم مكارم الأخلاق''

(میری بعثت اس لیے ہوئی ہے کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کرسکوں (الادب المفرد للبخاری)

اور ایک حدیث میں نبی رحمت ﷺ نے حسن خلق کو کمال ایمان کی کسوٹی قرار دیا فرمایا:

''أكمل المؤمنين إيماناً أحسنهم خلقاً'' مومن کامل وہ ہے جو حسن خلق میں سب سے اچھا ہے۔ (سنن ابی داود)۔

حسن خلق کے علاوہ اخلاق کے جتنے بھی مکارم ومحاسن اور اوصاف حمیدہ ہیں عفو ودرگزر، صبر وتحمل، کرم وسخاوت، حلم و بردباری، ایثار وقربانی، رفقت وشفقت، رحمت ومودت، عفت وعصمت، امانت ودیانت صدق وعدل، بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت، پڑوسیوں کے ساتھ معاملۂ احسان، رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی، دفع مضرت، جلب منفعت، استہزا وتمسخر اور سب و شتم سے دوری، ضعفاء ومساکین کے ساتھ ہمدردی، عورتوں کے ساتھ حسن سلوک حضور ﷺ نے ان تمام اوصاف کی قولی بھی ترغیب فرمائی اور خود آپ کی حیات مبارکہ میں ان تمام اوصاف ومحاسن کے بہترین اور اعلی ترین نمونے موجود ہیں۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو آپ کے چچازاد بھائی، سفر وحضر کے رفیق ہیں اور جن کی نفسیات انسانی اور اخلاق کی باریکیوں پر بہت گہری نظر تھی بیان کرتے ہیں: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم طبعاً بدکلامی، بے حیائی اور بے شرمی سے دور تھے اور تکلفا بھی ایسی کوئی بات آپ ﷺ سے سرزد نہ ہوتی تھی، بازاروں میں آپ ﷺ کبھی آواز بلند نہ فرماتے، برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیتے بلکہ عفو ودرگزر کا معاملہ فرماتے۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی پر دست درازی نہ فرمائی، سوائے اس کے کہ جہاد فی سبیل اللہ کا موقع ہو، کسی خادم یا عورت پر آپ ﷺ نے کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا، میں نے آپ ﷺ کو کسی ظلم وزیادتی کا انتقام لیتے ہوئے نہیں دیکھا، جب تک اللہ تعالی کی مقرر کردہ حدود کی خلاف ورزی نہ ہو اور اس کی حرمت وناموس پر آنچ نہ آئے، اپنی زبان مبارک محفوظ رکھتے، لوگوں کی دلداری فرماتے ان کو متنفر نہ کرتے، اپنے اصحاب کے حالات پر برابر خبر

رکھتے، لوگوں کے معاملات کے بارے میں دریافت فرماتے، اچھی بات کی اچھائی بیان کرتے اور اس کو قوت پہنچاتے، بری بات کی برائی بیان کرتے اور اس کو کمزور کرتے، آپ ﷺ کی نگاہ میں سب سے زیادہ افضل وہ تھا جس کی خیر خواہی اور اخلاق عام ہو، سب سے زیادہ قدر و منزلت اس کی تھی جو غم خواری اور ہمدردی اور دوسروں کی مدد اور معاونت میں سب سے آگے ہو، اگر کوئی شخص آپ ﷺ سے سوال کرتا اور کچھ مدد چاہتا تو آپ ﷺ اس کی ضرورت پوری کیے بغیر واپس نہ فرماتے، حاجت مند کو اپنے اوپر ترجیح دیتے اپنے صحابہ سے فرماتے کہ: تم کسی حاجت مند کو پاؤ تو اس کی مدد کرو۔ (شمائل الترمذی: 682)

صبر و تحمل اور نوازش و کرم میں آپ ﷺ کی نظیر نہیں تھی۔ حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چل رہا تھا آپ ﷺ اس وقت نجران کی چادر زیب تن کیے ہوئے تھے، اس کے کنارے موٹے تھے، راستے میں ایک اعرابی آپ ﷺ کو ملا اور آپ ﷺ کی چادر مبارک پکڑ کر زور سے کھینچی میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ آپ ﷺ کی گردن پر اس کے کھینچنے کی وجہ سے نشان پڑ گئے ہیں، پھر اس اعرابی نے کہا یا محمد ﷺ اللہ کا جو مال آپ کے پاس ہے وہ مجھے دینے کا حکم دیجیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور ہنسے پھر ہدایت کی کہ اس کو دے دیا جائے۔ (متفق علیہ)

مگر آج کے اس علمی، سائنسی اور عقلیات کے دور نے اخلاق و کردار کی تاثیر کے تصور سے محروم کر دیا ہے، خاص طور پر مسلمان بھول گئے کہ اخلاق اسلامیہ کی اثر آفرینی ہر اسلوب دعوت پر غالب و فائق ہے، اخلاق اسلامیہ کی اثر انگیزی ہی متکبرین و مغرورین کے ''من اشد منا قوۃ'' کے نعرہ غرور کی تسخیر کا عمل سرانجام دے سکتے ہیں۔

صد حیف کہ آج ہم اسلام کے اخلاقی پہلو کو نظر انداز کر کے محض یہ سمجھتے ہیں کہ خطبات و محاضرات، کتابوں کی تصنیف و تالیف، رسائل و مجلّات کی اشاعت درس و تدریس کے حلقے، مناظرات و محاورات اور خوب سارے دعوتی اسفار ہی دعوت اسلامی اور تبلیغ اسلام کے موثر و محدود ذرائع ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے وہ دعوت زیادہ مؤثر، مضبوط، کامیاب اور زود اثر ہوتی ہے، جس میں اخلاق اسلامیہ اور حضور ﷺ کے اخلاقی اوصاف و محاسن کی نمائندگی ہو۔ اسی لیے ضرورت ہے کہ آج ہم اسلام کے اس اخلاقی پہلو کی جانب متوجہ ہوں اور اپنی زندگیوں اور پھر اپنی دعوت کو اخلاق اسلامیہ اخلاق محمدیہ کے رنگ میں رنگ دیں، کیونکہ اس کے بغیر جتنی مرضی چاہیں کوشش کر لیں مگر ہم اسلام کا وہ نمونہ پیش نہیں کر سکتے جو نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ نے پیش فرمایا، ضرورت ہے کہ ہم قرآن کی اس دعوت پر کان دھر لیں: **لَقَد كَانَ لَكُم فِي رَسُولِ اللهِ أُسوَةٌ حَسَنَةٌ**'' بیشک رسول اللہ کی زندگی میں تمہارے لیے نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ **و ما توفيقي إلا بالله**

تنہائی کا استعمال

محمود الحسن مدراسی

تنہائی انسان کی زندگی کا ایک ایسا وقت ہے جب وہ دوسروں کی نظروں سے دور اور اپنے آپ کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے انسان اپنے رویے کا خیال رکھتا ہے، لیکن اصل آزمائش اس وقت سامنے آتی ہے جب اسے کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تنہائی صرف آرام یا مصروفیت سے بچنے کا وقت نہیں، بلکہ انسان کے کردار، ارادے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کو جانچنے کا بھی ایک موقع ہے۔

آج موبائل فون نے تنہائی کے وقت کو بھی مصروف بنا دیا ہے۔ انسان اکیلا بیٹھا ہو تو فوراً فون اٹھاتا ہے، سوشل میڈیا دیکھتا ہے، ویڈیوز چلاتا ہے یا مختلف چیزوں میں وقت گزار دیتا ہے۔ یوں جو وقت اپنے آپ کو سنوارنے، کچھ پڑھنے، سوچنے یا ضروری کام مکمل کرنے کے لیے استعمال ہو سکتا تھا، وہ بے مقصد اسکرولنگ میں گزر جاتا ہے۔ اس کا احساس عموماً اس وقت ہوتا ہے جب کافی وقت گزر چکا ہوتا ہے اور حاصل کچھ نہیں ہوا ہوتا۔

تنہائی کا ایک اچھا استعمال یہ بھی ہے کہ انسان اپنے دن کا جائزہ لے۔ اس نے کیا سیکھا، کہاں وقت ضائع کیا، کس سے زیادتی ہوئی، کون سا کام ابھی باقی ہے اور کل کیا بہتر کیا جا سکتا ہے؛ ایسی سوچ انسان کو اپنی اصلاح کا موقع دیتی ہے۔ اسی طرح قرآن پڑھنے، ذکر کرنے، دعا کرنے، مطالعہ کرنے یا کسی مفید ہنر پر توجہ دینے کے لیے تنہائی کا وقت بہت قیمتی ہو سکتا ہے۔

جو شخص اکیلے میں بھی اپنے وقت کی قدر کرتا ہے، وہ عموماً لوگوں کے درمیان بھی زیادہ ذمہ داری کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ لیکن تنہائی کا غلط استعمال انسان کو ایسی چیزوں تک بھی لے جا سکتا ہے جن سے وہ لوگوں کے سامنے بچتا ہے۔ موبائل اور انٹرنیٹ نے ایسی بہت سی چیزوں تک رسائی آسان کر دی ہے جنہیں دیکھنے یا کرنے کے لیے پہلے انسان کو خاص کوشش کرنا پڑتی تھی۔ اس لیے اکیلے میں خود کو بے لگام چھوڑ دینا خطرناک ہو سکتا ہے۔ انسان کو یہ شعور رکھنا چاہیے کہ لوگوں سے چھپ جانا اللہ تعالیٰ سے چھپ جانا نہیں ہے؛ اس لیے تنہائی میں بھی وہی احتیاط ہونی چاہیے جو دوسروں کے سامنے ہوتی ہے۔

تنہائی دراصل خالی وقت نہیں بلکہ انسان کے اختیار میں دیا گیا ایک موقع ہے۔ کوئی اسے گھنٹوں موبائل میں ضائع کر سکتا ہے اور کوئی اسی وقت میں اپنے علم، عبادت، کردار اور مستقبل کے لیے کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ ہماری اصل پہچان تو صرف لوگوں کے سامنے ہمارے رویے سے نہیں بنتی، بلکہ اس سے بھی بنتی ہے کہ جب کوئی ہمیں دیکھ نہیں رہا ہوتا تو ہم اپنے وقت اور اپنی خواہشات کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

یادرفتگاں

عارف باللہ

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ پرتاپ گڑھی

دوسری وآخری قسط

ابوطہ محمد صغیر پرتاپ گڑھی

زہد وقناعت

آپ کا زہد واستغناء اور دنیا سے بیزاری اپنے اعلیٰ مقام پر تھی۔ والد صاحب کی میراث سے اچھی خاصی زمین ملی تھی؛ مگر اس کی دیکھ بھال کی جانب کبھی متوجہ نہیں ہوئے؛ کچھ اراضی پر پڑوسیوں نے قبضہ کرلیا تو آپ نے اسے بھی دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور سب چھوڑ چھاڑ کر خانقاہ کی راہ اختیار فرمائی۔ شیخ طریقت حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الٰہ آبادی دامت برکاتہم اقوال سلف میں لکھتے ہیں:

''اگر کوئی کہتا کہ حضرت کسی چیز کی ضرورت ہو تو فرمایئے گا۔ فرماتے اب تک تو اپنی ضرورت کا اظہار کسی سے کیا نہیں۔ ہاں اگر کوئی خلوص سے کوئی چیز پیش کرتا ہے تو قبول کرلیتا ہوں۔ نیز کبھی فرماتے کہ ہماری یہ جیب حضرت ابو ہریرہؓ کی زنبیل ہے، جتنی ضرورت ہوتی ہے اسی سے نکال کر خرچ کرتا ہوں۔'' (اقوال سلف ۶/ ۱۲۶)

طریق اصلاح

آپ کے جانشین وخلیفہ شیخ طریقت عارف باللہ حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الٰہ آبادی زید مجدہ لکھتے ہیں:

''یوں آپ کا معمول اصلاح کے معاملہ میں رفق ونرمی ہی کا تھا، اس لئے کسی کو حتیٰ کہ مریدین کو بھی سخت بات نہ فرماتے، لیکن اگر ضرورت سمجھتے تو اصلاح کے لئے کبھی شدت بھی اختیار فرماتے۔ بدعات سے بہت نفرت تھی اور اس کے رد میں آپ بہت ہی سخت تھے۔ بیعت کے سلسلے میں بہت محتاط تھے۔ جلدی بیعت نہ فرماتے تھے۔'' (اقوال سلف: ۶/ ۱۲۴)

ذکر اللہ کا اہتمام

حضرت الٰہ آبادی مزید لکھتے ہیں: ''تلاوت قرآن پاک کا خاص اہتمام تھا۔ نماز میں بھی کلام اللہ کی تلاوت بڑے سوز و گداز سے فرماتے، جس سے سامعین متاثر ہوتے۔ سنا ہے کہ شروع میں ستر ہزار مرتبہ اسم ذات کا ورد فرماتے، مغرب بعد مکان

سے متصل باغ میں جا کر ذکر فرماتے اور کس حال و کیف سے فرماتے؟ اس کی ترجمانی خود اپنے اس شعر میں فرما دیا ہے:

گیا میں بھول گلستاں کے سارے فسانے　　دیا پیام کچھ ایسا سکوت صحرا نے

مگر اخیر عمر میں زیادہ تر ذکر قلبی کا ہی معمول تھا، تاہم کبھی تسبیح لے کر بھی پڑھتے تھے، اور کبھی ذکر بالجہر کر کے ہم لوگوں کو بغرض تعلیم سناتے تھے۔ (اقوال سلف ۱۲۵:۶)

ضیافت و خدمت

مہمانوں کا بہت اکرام فرمایا کرتے تھے اور ان کی ضیافت کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ اگر کوئی حضرت والا کے وطن خاص ''پھولپور'' سے پہنچ جاتا تو بدست خود کھانا، چائے وغیرہ کے لانے میں تکلف و توقف نہ فرماتے اور بوقت رخصت دور تک خصوصاً علماء کرام کو پہنچانے کا اہتمام فرماتے، بلکہ کبھی یہ شعر پڑھتے:

ترا آنا مرے احساس میں جان مسرت ہے　　مگر جانا ستم ہے، غم ہے، حسرت ہے، قیامت ہے

آپ کی خدمت میں بیمار دعا کرانے آتے، تعویذ لینے کے لئے بکثرت لوگ آتے، اکثر بے وقت ہی آتے، مگر سب کی غرض پوری فرماتے، خواہ کتنی ہی کلفت و مشقت برداشت کرنی پڑے۔ (ایضا)

قال و حال کی یکسانیت، شریعت و طریقت کی جامعیت اور فنا فی اللّٰہیت کے سبب اللہ ربّ العزت نے آپ کو بہت بافیض بنایا تھا۔ وہبی علوم سے آراستہ اس بافیض ہستی سے نہ جانے کتنے بڑے بڑے علماء اور فضلاء نے استفادہ کیا، جن میں اپنے زمانے کی بعض چنیدہ شخصیات بھی ہیں: مثلاً مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ، حضرت مولانا قاری محمد صدیق صاحب باندویؒ، حضرت مولانا ابرار الحق ہردوئیؒ، وغیرہم۔ ان حضرات کا حال یہ تھا کہ جب بھی موقعہ پاتے آپ کی صحبت کو غنیمت و سعادت سمجھتے ہوئے خدمت میں حاضر ہوتے اور وقت رہتا تو کئی ایک دن قیام بھی فرماتے۔

ان حضرات کے علاوہ اساطین علم و فضل میں سے بعض وہ شخصیات بھی ہیں؛ جنہوں نے آپ سے باقاعدہ اصلاح و تزکیہ کا تعلق قائم کیا اور اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے، ان میں سے چند ایک کے اسماء گرامی یہ ہیں:

شیخ طریقت حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الٰہ آبادی۔ حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحبؒ پرتاپ گڑھی ثم کراچوی (پاکستان)۔ حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین صاحب ندوی اعظم گڑھی۔ حضرت مولانا مجیب اللہ صاحب ندویؒ اعظم گڑھی۔ حضرت مولانا حکیم کلیم اللہ صاحب علی گڑھی۔ حضرت مولانا ظل الرحمان صاحبؒ بمبوی۔ حضرت مولانا مفتی منظور احمد صاحب کانپوریؒ۔ حضرت مولانا محمد عمار صاحب الٰہ آبادیؒ۔ (تذکرہ: ۲۸۷)

تالیفات

۱- روح البیان: یہ حضرت والا کے ان مواعظ اور تقاریر کا ایک ایمان افروز مجموعہ ہے؛ جن کو حضرت نے نہایت

دردوسوز، اخلاص وسادگی سے مختلف موقعوں پر بیان فرمایا ہے۔ اسے آپ کے خلیفہ حضرت مولانا محمد عمار صاحب الٰہ آبادیؒ نے جمع کیا۔ یہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔

۲-عرفان محبت: یہ حضرت کے عارفانہ اشعار کا ایک حسین گلدستہ ہے؛ جسے مولانا سیّد محمد الحسنیؒ نے بہت سلیقہ اورعمدگی سے عنوانات قائم کرکے مرتب کیا ہے۔ اس کی شرح شیخ طریقت حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الٰہ آبادی دامت برکاتہم نے ''فیضان محبت'' کے نام سے لکھی ہے۔

۳- صدائے غیب: یہ آپ ہی کے کلام کا ایک حسین مجموعہ مع تشریح ہے؛ جسے حضرت مولانا حکیم اختر صاحبؒ (پاکستان) نے جمع فرمایا ہے۔

۴-کمالات نبوّت: یہ مجموعہ حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی معرکۃ ال آراء تصنیف ''منصب امامت'' کے شروع کے حصے کا ترجمہ ہے، اس کے علاوہ اس میں دوسرے مضامین سیرت بھی شامل کئے گئے ہیں۔

۵-اخلاق سلف: یہ مجموعہ علامہ عبدالوہاب شعرانیؒ کی کتاب ''تنبیہ المغترین'' کی تلخیص ہے؛ جسمیں اسلاف کے اخلاق اوران کی تعلیمات پر سیر حاصل کلام ہے۔

شعروشاعری

آپ ایک قادرالکلام شاعر بھی تھے۔ لیکن آپ کی شاعری عام شاعری نہ تھی، عام شعراء سے ہٹ کر اپنے طرز کے، اپنے انداز کے اوراپنی شان کے نرالے وبے مثال شاعر تھے۔ آپ کا کلام اگر ایک طرف عارفانہ شان لئے ہوتا ہے، تو درسری طرف ادبیت وشعریت سے بھرپور ہونے کے ساتھ ساتھ بے پناہ روانی وبے ساختگی کا بھی حامل ہے۔ آپ کی آواز میں بلا کا سوز وگداز، غضب کی تاثیر اور بے پناہ کشش تھی۔ اپنا کلام جب خود پڑھتے تو وجد کی سی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ پڑھنے کا انداز نرالا، بے ساختہ اورانتہائی جاذب تھا۔ جس نے بھی آپ کی زبان مبارک سے آپ کا کلام سن لیا وہ نہ صرف آپ کے کلام کا عاشق اور گرویدہ ہوجاتا؛ بلکہ آپ کی ذات سے بھی اس کو گہری وابستگی اورعقیدت ہوجاتی۔

مفکراسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے کلام کی بابت تحریر فرماتے ہیں:

''آپ کا کلام نظم ہو یا نثر، اسی خم خانۂ معرفت ووحدت کی شراب طہور ہوتی ہے؛ جس سے حاضرین مجلس کو نہ سیر ہوتی، نہ گرانی بلکہ ان کی زبان پر یہ ہوتا:

مصلحت نیست مرا سیری ازیں آب حیات ضاعف اللہ بہ کل زمان عطشی

(مقدمہ روح البیان :۲/۷)

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری (اعظم گڑھی) رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

''اللہ والے سراپا درد ہوتے ہیں، ہمارے دوست مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی بھی سراپا درد ہیں۔ ماشاء اللہ

ان کا کلام بڑا دردناک ہوتا ہے۔'' (مقدمہ روح البیان :۲/۲۷)

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی دامت برکاتہم جو حضرت شاہ فضل الرحمان گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار ہیں، سراپا محبت اور اہل دل ہیں، موصوف کا کلام بھی نوارنیت سے معمور اور قلوب سالکین وعاشقین کے لئے آب حیات ہے۔ (مقدمہ روح البیان :۲/۳۰)

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''مولانا کا منظوم کلام عام یا عامیانہ شاعری کے طرز پر نہیں، بلکہ وہ ایک عارفانہ منظوم کلام ہے، مولانا کی شاعری کا عنصر گل وبلبل کی داستاں، یا ساغر وصہبا اور قلقل ومینا کی حکایت نہیں ہے، ان کی شاعری کا عنصر درس توحید، توقیر رسالت، درد ومحبت، نور معرفت، تسلیک وتربیت ہے۔ انکی شاعری میں غالب کی شاعری کا نہیں بلکہ مولانا رومؒ کی شاعری کا رنگ جھلکتا ہے۔ مطمح نظر وہ نہیں ہے؛ جو عام شاعروں کا ہوتا ہے، اس لئے ان کے کلام میں شاعرانہ فنکاری کی نمائش نہیں، ان کا کلام عارفانہ ومربیانہ ہے۔ آپ کے اشعار کی حقیقت خود آپ کی زبانی ملاحظہ ہو:

درد غم کی داستاں ہے یہ نہیں شعر وسخن　　تو تڑپ اٹھتا لگی ہوتی اگر دل میں لگن (تقریظ روح البیان :۱۴)

آخر میں بطور نمونہ چند ایک اشعار ملاحظہ ہوں:

بعض سالکین طریقت مجاہدات سے گھبراتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ معاصی اور گناہوں کا تقاضا ہی ختم ہوجائے۔ حضرت فرماتے ہیں! کمال یہ نہیں ہے، کمال تو یہ ہے کہ زندگی بھر مجاہدہ کے لئے تیار رہے۔ پروانہ کی طرح ایک دم جل کر مرجانا کمال نہیں، عشق کی آگ میں جلتے رہنا اور ہزار بار جینا ہزار بار مرنا کمال ہے:

کمال عشق تو مرمر کے جینا ہے نہ کہ مرجانا　　ابھی اس راز سے واقف نہیں ہیں ہائے پروانے

اتباع سنت وشریعت کی ضرورت واہمیت کو واشگاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اگر آزاد ہم ہوتے خدا جانے کہاں ہوتے　　مبارک عاشقوں کے واسطے دستور ہوجانا

معرفت الٰہی کا راستہ دکھاتے ہوئے بادۂ توحید کی سرمستی میں فرماتے ہیں:

کسی کے سامنے میں کیوں جھکوں پرواہ کیا مجھ کو　　خدا کے سامنے جب شوق سے گردن مری خم ہے

غلط ہر غیر پر مجھ کو اگر کچھ بھی بھروسہ ہے　　بجز اللہ اپنا کوئی مونس ہے نہ ہمدم ہے

مقام رسالت کی عظمت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

اللہ کا انکار ہے انکار محمد　　اللہ کا اقرار ہے اقرار محمد

گر دیدۂ بینا ہو عطا تو نظر آئے　　انوار الٰہی سے ہیں انوار محمد

نیز فرماتے ہیں:

آپ کی مدح انسان کیا کر سکے　　عرش سے جب درود وسلام آ گیا

بارگاہ رسالت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کبھی نہ مجھ کو تمنا ہو باغ رضواں کی　　اگر مدینہ میں میرا قیام ہو جائے

ایک جگہ فرماتے ہیں:

مدینہ کی پھر یاد آنے لگی ہے　　جنون محبت بڑھانے لگی

تصور میں کس کو یہ لانے لگی　　مرے دل پہ بجلی گرانے لگی

پڑھوں کیوں نہ دل سے درود وسلام　　مجھے لذت دید آنے لگی　　(عرفان محبت)

سلوک کا حاصل اپنے آپ کو مٹا دینا ہے، اسی حقیقت کو واشگاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کچھ ہونا میرا ذلت وخواری کا سبب ہے　　یہ ہے مرا اعزاز کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں　　(صدائے غیب)

اللہ رب العزت جس حال میں رکھیں وہی حال بہتر ہے، اپنی تجویز کا راستہ نافع نہیں:

بے کیفی میں بھی ہم نے تو ایک کیف مسلسل دیکھا ہے

جس حال میں بھی وہ رکھتے ہیں اس حال کو اکمل دیکھا ہے

جس راہ کو ہم تجویز کریں اس راہ کو ثقل دیکھا ہے

جس راہ سے وہ لے جاتے ہیں اس راہ کو اسہل دیکھا ہے

اللہ رب العزت کی معیت خاصہ کی لذت کو کس انداز سے بیان کرتے ہیں:

معیت گر نہ ہو تیری تو گھبراؤں گلستاں میں　　رہے تو ساتھ تو صحراء میں گلشن کا مزہ پاؤں

احباب کی ملاقات کی مسرت کو اور جدائی کے غم کو یوں بیان فرماتے ہیں:

ترا آنا مرے احساس میں جان مسرت ہے

مگر جانا ستم ہے، غم ہے، حسرت ہے، قیامت ہے

علماء کو عشق ومحبت اور باطنی دولت کی تحصیل اور علم نبوت کے ساتھ نور نبوت سے اپنے سینے کو منور کرنے کی تلقین فرماتے ہیں:

نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے میں کچھ کہہ نہیں سکتا　　جو دستار فضیلت گم ہو دستار محبت میں

تزکیہ نفس کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

نہ جب تک تزکیہ ہو نفس کا خطرہ ہی خطرہ ہے　　رہیں گے عمر بھر گھیرے ہوئے افکار شیطانی

اصلاح وتزکیہ نہ کرنے اور نفس کو آزاد رکھنے کا ثمرۂ بد بیان کرتے ہیں:

نہیں کی جس نے اپنے نفس امّارہ کی قربانی — وہ کیا سمجھے، وہ کیا جانے ہے کیا شئ فضل یزدانی
نہیں جس نے کیا پامال اپنے نفس سرکش کو — نہیں آزاد وہ آزاد ہو کر بھی ہے زندانی

ایک طویل نظم میں آپ نے مسلمانوں کو عام خطاب کیا ہے اور ان کو دعوت وتبلیغ کا فریضہ یاد دلایا ہے؛ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دل کو خدا کے واسطے پھر دل بنائیے — یعنی خدا کی یاد سے اس کو بسائیے
سنتے ہیں ان کی مرضی پہ سب کچھ لٹائیے — اسلام لا چکے ہیں اب ایمان لائیے
رحمت کا، ابر بن کر جہاں بھر میں چھائیے — عالم یہ جل رہا ہے، برس کر بجھائیے
خلق نبی کا اب تو نمونہ دکھائیے — اغیار کو بھی اپنے گلے سے لگائیے

ترمیم اشعار

عظیم ناقد ومصنف محترم جناب شمس الرحمان فاروقی صاحب رقم طراز ہیں: ''ہماری شعری روایت میں تضمین کے فن کو خاص اہمیت حاصل ہے، تضمین کے ذریعہ شاعر ایک دوسرے کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں، کسی شعر میں جو مضمون یا معنی بیان ہوتے ہیں ان کی توسیع وترقی کرتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی رحمۃ اللہ علیہ نے تضمین سے ملتی جلتی ایک اور صنف ایجاد کی ہے کہ اگلوں کے کسی شعر میں تھوڑا بہت تصرف اور ترمیم کر کے شعر کی کایا پلٹ دی۔ اس طرح شعر میں کوئی عارفانہ یا حکیمانہ بات تو بیان ہی ہو جاتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ حضرت مولانا کا مطمح نظر اور طریق فکر بھی واضح ہو جاتا ہے۔'' (عرفان محبت پر ایک اجمالی تبصرہ۔ فیضان محبت: ۲۱۰)

اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شعر: جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ترمیم: جانتے گر ثواب طاعت وزہد — پھر طبیعت ادھر نہ کیوں آتی

شعر: عشق نے غالب نکما کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
ترمیم: عشق نے احمد مجلّی کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے نام کے

شعر: کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
ترمیم: قتل کے بعد بھی نادم وہ جفا سے نہ ہوا — اس نے سیکھا ہی نہیں ہائے پشیماں ہونا

شعر: کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب — شرم تم کو مگر نہیں آتی
ترمیم: میں اسی منہ سے کعبہ جاؤں گا — شرم کو خاک میں ملاؤں گا
روؤں گا خوب گڑگڑاؤں گا — توبہ کر کے انہیں مناؤں گا

ان کی مرضی پہ اب چلوں گا میں — منہ کو اپنے منہ بناؤں گا

شعر: بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا میں — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ترمیم: کہہ رہا ہوں میں ہوش میں کیا کیا — کچھ تو سمجھے خدا کرے کوئی

شعر: بھڑکا رہا ہوں آتش عصیاں ہر سمت — پھیلا رہا ہوں رحمت پروردگار کو

ترمیم: بھڑکا رہا ہوں آتش عصیاں ہر ایک سمت — ناراض کر رہا ہوں میں پروردگار کو

شعر: گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز — کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

ترمیم: گلشن سے عشق ہے مجھے گل ہی نہیں عزیز — کانٹوں کو دل سے پیار کئے جا رہا ہوں میں

ہندی دوہہ: لکڑی جل کوئلہ بھیو کوئلہ جل بھیو راکھ — میں پاپن ایسی جلی کہ کوئلہ بھیو نہ راکھ

ترمیم: لکڑی جل کوئلہ بھیو کوئلہ جل بھیو راکھ — میں پاپی ایسا جلا کہ ہو گیا بالکل پاک

وفات حسرت آیات و پسماندگان

ابتداء میں آپ کا قیام مستقلاً اپنے وطن پھولپور میں ہی رہتا تھا اور کبھی کبھی شہر پرتاپ گڈھ میں بابا نجم الحسن کے مکان پر قیام کرتے، ان کے پاکستان چلے جانے کے بعد وکیل عبدالوحید کے مکان پر ہوتا۔ ۱۹۳۲ء سے شہر الٰہ آباد میں بھی کبھی کبھی قیام فرمانے لگے تھے، یہ قیام ابتداء میں ''محلہ دارا گنج'' میں ہوتا تھا، اس کے بعد کچھ دنوں محلہ ''کٹرہ ودریا آباد'' میں بھی رہا۔ پھر ۱۴۰۰ھ سے چار سال تک ''مدرسہ بیت المعارف'' کے شمالی حجرہ میں قیام رہا۔ دیرینہ مرض بواسیر نیز کبرسنی کی وجہ سے ضعف و کمزوری میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس لئے آخری عمر میں اپنے معالج خاص ڈاکٹر ابرار احمد صاحب کے مکان پر مستقلاً قیام پذیر ہو گئے اور سفر وغیرہ بالکل بند کر دیا؛ حتی کہ وطن پرتاپ گڑھ و پھولپور بھی جانا بند ہو گیا تھا۔ وفات سے کچھ دنوں پہلے سینہ میں درد شروع ہوا، علاج برابر چل رہا تھا؛ مگر درد بڑھتا ہی گیا اور بیہوشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی، جس کا سلسلہ کافی دنوں تک رہا۔ بالآخر ۳/ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۲/اکتوبر ۱۹۹۱ء یکشنبہ کی شب اللہ کا یہ پیارا اپنے محبوب حقیقی سے جا ملا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

بعد نماز ظہر منصور پارک (الہ آباد) میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اژدہام اس قدر تھا کہ تعداد و شمار کا اندازہ مشکل تھا۔ تا حد نظر انسانوں کا سیل رواں ہر طرف دکھائی دیتا تھا۔ نماز کے بعد عاشق حق کا جنازہ محبوبانہ شان کے ساتھ عشاق کے دوش پر روانہ ہو کر محلہ آرام باغ ''اکیلا آم'' نامی قبرستان پہونچا اور وہیں مجمع کثیر کے ہاتھوں تدفین عمل میں آئی۔ **برّد اللہ مضجعہٗ**۔ آپ کے لوح مزار پر آپ ہی کا شعر لکھا ہے؛ جو آپ کی پوری زندگی کا صحیح ترجمان ہے:

آتش عشق نے جلا ڈالا
زندگی ہم نے مر کے پائی ہے

فقہ وفتاوی

مفتی محمد ریحان گودھروی

سوال.....: مرد کے لیے چاندی کی کتنے گرام کی انگوٹھی پہننا جائز ہے، نیز کونسے ہاتھ میں اور کونسی انگلی میں انگوٹھی پہن سکتا ہے؟

جواب .....: مردوں کے لیے ایک مثقال سے کم وزن کی چاندی کی انگوٹھی پہننا جائز ہے، اور ایک مثقال ساڑھے چار ماشے یعنی 4/گرام، 374/ملی گرام کا ہوتا ہے، اسی طرح انگوٹھی دائیں ہاتھ میں پہننا چاہیے اور رہی بات کہ کس انگلی میں پہننی چاہیے؟ تو مسلم شریف اور نسائی شریف میں روایت ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہادت والی انگلی اور بیچ والی انگلی میں انگوٹھی پہننے سے منع فرمایا ہے لہذا بہتر ہے کہ چھوٹی اُنگلی یا اُس کے برابر والی اُنگلی میں اَنگوٹھی پہنی جائے، اور شہادت اور درمیانی اُنگلی میں اَنگوٹھی پہننا مردوں کے لئے ممنوع ہے۔

عن أنس رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يتختم في يمينه۔ (سنن النسائي، كتاب الزينة/باب موضع الخاتم ۲/ ۲۵۱ رقم: ۵۲۹۳، دار الفكر بيروت)

قال علي رضي الله عنه: قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم: يا علي! سل الله الهدىٰ والسداد، ونهاني أن أجعل الخاتم في هٰذه وهٰذه، وأشار يعني بالسبابة والوسطىٰ۔ (سنن النسائي، كتاب الزينة، باب النهي عن الخاتم في السبابة: ۲/ ۲۴۶ رقم: ۵۲۲۰ دار الفكر بيروت، وكذا في سنن الترمذي، أبواب اللباس: ۱/ ۳۰۸) ذكر في الجامع الصغير: وينبغي أن تكون فضة الخاتم المثقال، ولا يزاد عليه وقيل: لا يبلغ به المثقال وبه ورد الأثر، كذا في المحيط. الفتاوى الهندية (335/5)

سوال.....: نمک کے اسٹون (پتھر) سے تیمم کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب.....: صورت مسئولہ میں نمک کا اسٹون، پہاڑی نمک کا ہو تو چونکہ پہاڑی نمک زمین ہی کے اجزاء میں سے ہے، اس لئے اس پر تیمم کرنا شرعاً جائز ہے، اور اگر اسٹون سمندری نمک کا ہے، تو اس پر تیمم کرنا جائز نہیں ہے، عموماً جو نمک رائج ہے، وہ سمندری ہوتا ہے، اس لیے احوط یہی ہے کہ نمک کے اسٹون سے تیمم نہ کیا جائیں۔

كماقال العلامة ابراهيم الحلبي رحمہ اللہ: ولو تيمّم بالملح نظر ان كان مائيا اى كان ماء فجمد

لایجوز لانہ لیس من اجزاء الارض، وان کان جبلھاای معدنیا وھوما استحال ملحا من اجزاء الارض یجوز بہ التیمّم لانہ من جنس الارض۔(کبیری: ص/۶۷، باب التیمّم)

أما الملح فإن کان مائیا فلا یجوز بہ اتفاقا وإن کان جبلیا ففیہ روایتان وصحح کل منھما ولکن الفتوی علی الجواز. ھکذا في البحر الرائق. (الفتاوي الھندیۃ ۱/۲۷، بیروت)

سوال.....:، نیز قرآن مجید کی کوئی آیت یا کوئی نعت وغیرہ فٹ کر سکتے ہیں کہ نہیں؟

جواب.....: فتاویٰ رحیمیہ میں ہے: رنگ ٹون میں اللہ اکبر کی صدا فٹ کرنا کیسا ہے؟۔جواب: اس بیل کا استعمال جائز نہیں، اس میں اللہ عزوجل کے مبارک اور بے حد قابل عظمت نام کو کسی کو اپنے آنے کی خبر دینے یا کسی کو بلانے کے لیے استعمال کرنا لازم آتا ہے، اور یہ جائز نہیں گناہ کا کام ہے، اس کے اس طرح استعمال کرنے میں اللہ تعالیٰ کے پاک اور مبارک نام کی توہین ہے، لہذا گھر پر یا آفس میں اسے استعمال نہ کیا جائے، اللہ کا مبارک نام خالص ذکر الٰہی کی نیت اور ارادہ سے لینا چاہیے، اپنی کوئی دنیوی غرض پوری کرنے کے لیے اس مبارک نام کو استعمال کرنا بہت ہی نامناسب اور ایمانی غیرت کے منافی ہے۔(:۱۰/۳۳۵)

نیز فقہائے کرام نے ذکر اللہ کو اعلام کی جگہ استعمال کرنے سے منع کیا ہے، اسی طرح بعض اوقات فون سننے والا بیت الخلاء میں ہوتا ہے، فون آنے پر قرآنی آیت کے فون پر جاری ہونے میں ان کی بے ادبی ہوگی۔اس لیے آدمی کو فون میں رنگ ٹون میں قرآن ونعت وغیرہ کی جگہ سادی گھنٹی استعمال کرنی چاہیے۔

وقد کرھوا واللہ اعلم ونحوہ لاعلام ختم الدرس حین یقرر اما اذالم یکن اعلاما بانتھائہ لایکرہ لانہ ذکر وتفویض بخلاف الاول فانہ استعملہ آلۃ للاعلام ونحوہ اذا قال الداخل یااللہ مثلا لیعلم لمجیئہ۔ لیھیئوا لہ محلا ویوقروہ واذا قال الحارس لا الہ الا اللہ ونحوہ لیعلم باستیقاظہ فلم یکن المقصود الذکر اما اذا اجمع القصدان یعتبر الغالب۔(الشامیۃ: ۱/۴۳۲)

افسانہ

قصہ چہار درویش

قسط: ۱۴ از: میر امن دہلوی

(سیر دوسرے درویش کی:)

غرض اس میانے میں بیٹھی خدا سے لو لگائے رہتی تھیں۔ اور یہ کبت اس دم پڑھتی تھیں:

جب دانت نہ تھے تب دودھ دیو، جب دانت دیے کا ہے ان نہ دے ہے
جو جل میں تھل میں پنچھی پس کی سدھ لیت، سو تیری بھی لے ہے
کا ہے کو سوچ کرے من مورکھ، سوچ کرے کچھ ہاتھ نہ آئے ہے
جان کو دیت، ابا جان کو دیت، جہاں کو دیت سو تو کو بھی دے ہے

سچ ہے جب کچھ بن نہیں آتا۔ تب خدا ہی یاد آتا ہے۔ نہیں تو اپنی اپنی تدبیر میں ہر ایک لقمان اور بوعلی سینا ہے۔ اب خدا کے کارخانے کا تماشا سنو۔ اسی طرح تین دن رات صاف گزر گئے کہ ملکہ کے مُنہ میں ایک کھیل بھی اُڑ کر نہ گئی۔ وہ پھول سا بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا اور وہ رنگ جو کندن سا دمکتا تھا، ہلدی سا بن گیا۔ مُنہ میں پھپھڑی بندھ گئی، آنکھیں پتھرا گئیں، مگر ایک دم اٹک رہا تھا کہ وہ آتا جاتا تھا۔ جب تلک سانس تب تلک آس۔ چوتھے روز صبح کو ایک درویش، خضر کی سی صورت، نورانی چہرہ، روشن دل آ کر پیدا ہوا۔ ملکہ کو اس حالت میں دیکھ کر بولا اے بیٹی! اگرچہ تیرا باپ بادشاہ ہے لیکن تیری قسمت میں یہ بھی بدا تھا۔ اب اس فقیر بوڑھے کو اپنا خادم سمجھ اور اپنے پیدا کرنے والے کا رات دن دھیان رکھ۔ خدا خوب کرے گا۔ اور فقیر کے کشکول میں جو ٹکڑے بھیک کے موجود تھے، ملکہ کے روبرو رکھے اور پانی کی تلاش میں پھرنے لگا دیکھتے تو ایک کنواں تو ہے پر ڈول رسّی کہاں جس سے پانی بھرے؟ تھوڑے پتّے درخت سے توڑ کر دونا بنایا اور اپنی سیلی کھول کر اس میں باندھ کر نکالا اور ملکہ کو کچھ کھلایا پلایا۔ بارے ٹک ہوش آیا۔ اس مردِ خدا نے بے کس اور بے بس جان کو بہت سی تسلّی دی، خاطر جمع کی اور آپ بھی رونے لگا۔ ملکہ نے جب غم خواری اور دل داری اس کی بے حد دیکھی، تب ان کی رجا کو استقلال ہوا۔

اس روز اس پیر مرد نے یہ مقرّر کیا کہ صبح کو بھیک مانگنے نکل جاتا۔ جو ٹکڑا پارچہ پاتا، ملکہ کے پاس لے آتا اور کھلاتا۔ اس طور سے تھوڑے روز گزرے۔ ایک روز ملکہ نے تیل سر میں ڈالنے اور کنگھی چوٹی کرنے کا قصد کیا۔ جوں ہی مباف کھولا، چٹلے میں سے ایک موتی کا دانہ گول آب دار نکل پڑا۔ ملکہ نے اس درویش کو دیا اور کہا کہ شہر میں اسے بیچ لاؤ۔ وہ فقیر اس گوہر کو بیچ کر اس کی قیمت بادشاہ زادی کے پاس لے آیا۔ تب ملکہ نے حکم کیا کہ ایک مکان موافق گزران کے اسی جگہ بنواؤ۔ فقیر نے

کہا اے بیٹی! نیو دیوار کی کھود کر تھوڑی سی مٹی جمع کرو۔ ایک دم میں پانی لا کر گارا کر کر گھر کی بنیاد درست کر دوں گا۔ ملکہ نے اس کے کہنے سے مٹی کھودنی شروع کی۔ جب ایک گز عمیق گڑھا کھود گیا۔ زمین کے نیچے سے ایک دروازہ نمودار ہوا، ملکہ نے اس در کو صاف کیا۔ ایک بڑا گھر جواہر اور اشرفیوں سے معمور نظر آیا۔ ملکہ نے پانچ چار لب اشرفیوں کی لے کر پھر بند کر دیا، اور مٹی دے کر اوپر سے ہموار کر دیا۔

اتنے میں فقیر آیا، ملکہ نے فرمایا کہ راج اور معمار کاریگر اور اپنے کام کے استاد اور مزدور جلد بلاؤ جو اس مکان پر ایک عمارت بادشاہانہ کہ طاقِ کسریٰ کا جفت ہو، اور قصرِ نعمان سے سبقت لے جائے اور شہر پناہ اور قلعہ اور باغ اور باؤلی اور ایک مسافر خانہ کہ لاثانی ہو، جلد تیّار کریں، لیکن پہلے نقشہ ان کا ایک کاغذ پر دست کر کے حضور میں لاویں جو پسند کیا جائے۔ فقیر نے ایسے ہی کارکن، کارکردہ، ذی ہوش لا کر حاضر کیے، موافق فرمانے کے تعمیر عمارت کی ہونے لگی۔ اور نوکر چاکر ہر ایک کارخانہ جات کی خاطر چُن چُن کر فہمیدہ اور بادیانت ملازم ہونے لگے۔ اس عمارت عالیشان کی تیاری کی خبر رفتہ رفتہ بادشاہ ظل سبحانی کو جو قبلہ ملکہ کے تھے، پہنچی۔ سن کر بہت متعجّب ہوئے اور ہر ایک سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے جس نے یہ محلات بنانے شروع کیے ہیں؟ اس کیفیت سے کوئی واقف نہ تھا جو عرض کرے۔ سبھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھے کہ کوئی غلام نہیں جانتا کہ اس کا بانی کون ہے؟ تب بادشاہ نے ایک امیر کو بھیجا اور پیغام دیا کہ میں ان مکانوں کو دیکھنے آیا چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی معلوم نہیں تم کہاں کی بادشاہ زادی ہو اور کس خاندان سے ہو؟ یہ سب کیفیّت دریافت کرنی اپنے تئیں منظور ہے۔ جوں ہی ملکہ نے یہ خوش خبری سنی، دل میں بہت شاد ہو کر عرضی لکھی کہ جہاں پناہ سلامت! حضور کے تشریف لانے کی خبر طرف غریب خانے کی سُن کر نہایت خوشی حاصل ہوئی۔ اور سبب حرمت اور عزّت اس کمترین کا ہوا۔ زہے طالع اس مکان کے! کہ جہاں قدم مبارک کا نشان پڑے، اور وہاں کے رہنے والوں پر دامن دولت سایہ کرے اور نظرِ توجّہ سے وہ دونوں سرفراز ہوویں۔ یہ لونڈی امیدوار ہے کہ کل روز پنج شنبہ مبارک ہے اور میرے نزدیک بہتر نوروز سے ہے۔ آپ کی ذات مشابہ آفتاب کے ہے، تشریف فرما کر اپنے نور سے اس ذرّہ بے مقدار کو قدر و منزلت بخشے۔ اور جو کچھ اس عاجزہ سے میسّر ہو سکے نوش جان فرمایئے۔ یہ عین ریب نوازی اور مسافر پروری ہے، زیادہ حد ادب، اور اس عمدہ کو بھی کچھ تواضع کر رخصت کیا۔

بادشاہ نے عرضی پڑھی اور کہلا بھیجا کہ ہم نے تمہاری دعوت قبول کی، البتّہ آویں گے۔ ملکہ نے نوکروں اور سب کاروباریوں کو حکم کیا کہ لوازمہ ضیافت کا ایسے سلیقے سے تیار ہو کہ بادشاہ دیکھ کر اور کھا کر بہتر محظوظ ہوں اور ادنیٰ اعلیٰ جو بادشاہ کے آویں سب کھا پی کر خوش ہو کر جاویں۔ ملکہ کے فرمانے اور تاکید کرنے سے سب قسم کے کھانے سلونے اور میٹھے ذائقے کے تیّار ہوئے کہ اگر برہمن کی بیٹی کھاتی تو کلمہ پڑھتی۔ جب شام ہوئی بادشاہ منڈے تخت پر سوار ہو کر ملکہ کے مکان کی طرف تشریف لائے۔ ملکہ اپنی جان خواص سہیلیوں کو لے کر استقبال کے واسطے چلیں۔ جوں بادشاہ کے تخت پر نظر پڑے اس آداب سے مجرا شاہانہ کیا کہ یہ قاعدہ دیکھ کر بادشاہ کو اور بھی حیرت نے لیا، اور اسی انداز سے جلوہ کر کر بادشاہ کو تخت مرصع پر لا بٹھایا۔ (جاری)

جامعۃ السعادۃ واسعادالبنات کیرانہ

شاخ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

''جامعۃ السعادۃ'' مغربی یوپی کے مردم خیز قصبہ ''کیرانہ، شاملی'' کا ایک عظیم ومنفرد ادارہ ہے۔جس کے مقاصد میں سے قرآن وحدیث کی ترویج واشاعت کے ساتھ، ایسے باصلاحیت رجال کار تیار کرنا ہے، جو ملت اسلامیہ کی علمی، دینی اور فکری قیادت کا فریضہ انجام دے سکیں اور اپنی خوابیدہ قوم کو بیدار کرسکیں۔

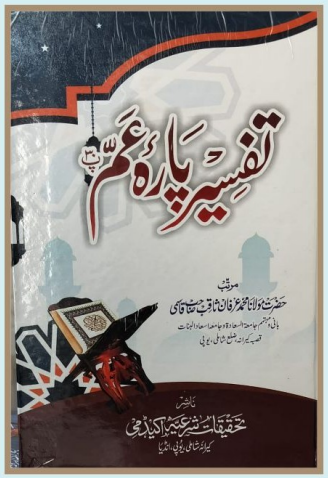
یہ ادارہ ۱۴۲۸ھ سے علم کی شمع جلانے اور اس کی لو کو تیز کرنے میں مصروف ہے، بچوں اور بچیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ، عربی، اردو اور انگریزی زبان بولنے ولکھنے کی ان کے اندر صلاحیت پیدا کرنے اور صحیح ڈھنگ سے ان کی تربیت کرنے، نیز عوام الناس میں دینی بیداری پیدا کرنے اور انہیں اسلامی تعلیمات سے واقف کرانے کے لئے اس کے خصوصی تعلیمی وتربیتی پروگرام اور انتہائی علمی ووقیع رسالہ ''تحقیقات اسلامی'' کی پابندی کے ساتھ اشاعت ایسے کارنامے ہیں کہ کم ہی ادارے اس قلیل مدت میں اس منزل کو حاصل کر پاتے ہیں۔جامعہ کی مستقل اپنی انتہائی خوبصورت ودیدہ زیب دومنزلہ عمارت ہے، جس میں تعلیمی، تربیتی اور دعوتی ۱۴ رشعبے قائم ہیں۔طلبہ کی ایک کثیر تعداد دارالاقامہ میں مقیم ہے جن کے قیام وطعام اور لباس وفوری علاج کا جامعہ میں انتظام ہے اور دیگر ہر طرح کی سہولیات انہیں فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

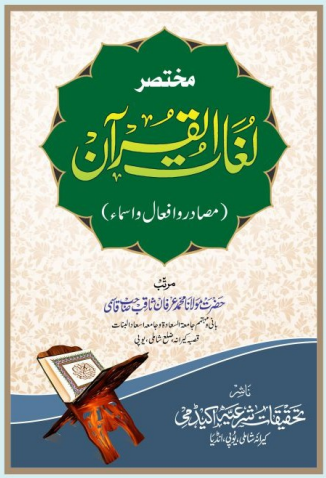
جامعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ملحق ہے، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی کے نصاب کے مطابق ثانویہ اولیٰ سے عالیہ ثانیہ تک کی تعلیم کے ساتھ حفظ مع تجوید، ناظرہ قرآن کریم، دینیات اور حکومت ہند سے منظور شدہ: جامعۃ السعادۃ للدارین پبلک اسکول کے تحت درجہ آٹھ تک کی تعلیم ماہر اساتذہ کی نگرانی میں جاری ہے۔

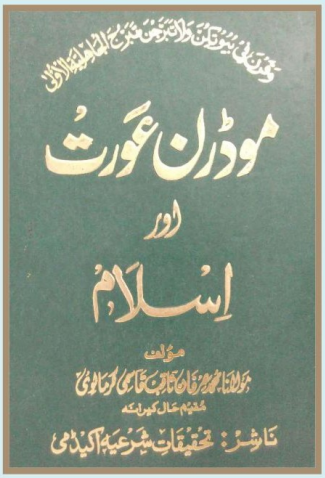
جب کہ بچیوں کی خصوصی تعلیم وتربیت کے لئے علاحدہ سے ''جامعہ اسعادالبنات'' قائم ہے۔اس کی بھی دومنزلہ انتہائی محفوظ، خوبصورت اور ہر طرح کی سہولیات سے مزین عمارت ہے۔بچیوں کی نگرانی اور ان کی تعلیم وتربیت کے لئے باصلاحیت عالمائیں مامور ہیں، یہ ادارہ بھی ندوۃ العلماء سے ملحق ہے۔جس میں ندوہ ہی کے نصاب ونظام کے مطابق از درجہ پرائمری تا دورہ حدیث شریف کی تعلیم جاری ہے، ساتھ ہی کمپیوٹر اور دست کاری (سلائی، کڑھائی، امور خانہ داری) بھی سکھائی جاتی ہے۔

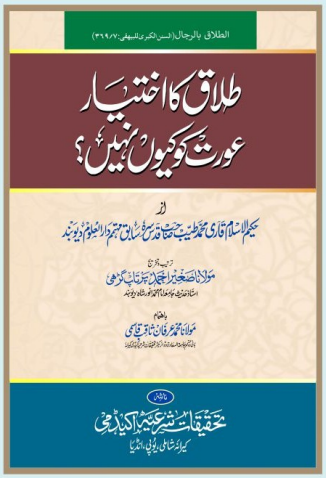
جامعہ کی مستقل آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔مخیّر حضرات سے اپیل ہے کہ صدقات، زکوٰۃ اور عطیات کی رقوم سے جامعہ کا تعاون فرمائیں۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین

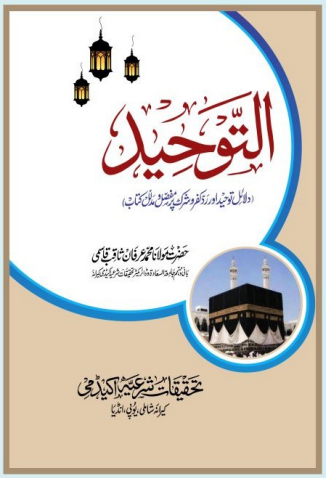
محمد عرفان ثاقب قاسمی
محلہ ابراہیم پورہ (آل کلاں) شاملی روڈ، کیرانہ ضلع شاملی۔یوپی 247774
رابطہ نمبر: 9359602830 / 09319530768























JAMIATUS SA'ADAH
Moh.Ibrahim Pura, (Aal Kalan) Shamli Road,
Kairana, Distt. Shamli U.P Pin: 247774
Mob: 09359602830, 09319530768